

ماہنامہ محدث لاہور

شمارنمبر:10 ــــ جلد نمبر1 ــــ شمارہ نمبر11 ــــ اکتوبر1971ء ــــ شعبان المعظم1391ھ

ماہنامہ 'محدث' لاہور کا اجمالی تعارُف

مُدیر اعلیٰ: حافظ عبدالرحمٰن مدنی   مُدیر: ڈاکٹر حافظ حسن مدنی

ماہنامہ 'محدث' لاہور، ہندوستان سے نکلنے والے ایک رسالے کی ارتقائی شکل ہے۔ جامعہ رحمانیہ دہلی سے نکلنے والے رسالے۔جس کا نام محدث تھا کو پروان چڑھاتے ہوئے تقسیم ہند کے بعد دوبارہ ماہنامہ 'محدث' لاہور کے نام سے پاکستان میں معروف عالم دین ودانشور حافظ عبدالرحمٰن مدنی نے اس کا اِجراء کیا۔ یہ تحقیقی رسالہ 1970ء سے اب تک کامیابی وکامرانی سے شائع ہو رہا ہے، وللہ الحمد!

محدث کی علمی پہچان کے حوالے سے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ ہر صاحبِ علم وفضل کی ضرورت بن چکا ہے کیونکہ اس کے مضامین جدید فکر کے حامل اور ملحدانہ افکار کیلئے شمشیر بے نیام کی حیثیت رکھتے ہیں۔

گھر بیٹھے 'محدث' وصول کیجئے!

ماہنامہ محدث لاہور

اجرائے مُحدث کے مقاصد

عناد اور تعصّب قوم کیلئے زہر ہلاہل کی حیثیت رکھتے ہیں!

لیکن تعصّبات سے بالاتر رہ کر افہام و تفہیم اُمت کیلئے رحمت کا باعث ہے۔

علومِ جدیدہ سے ناواقفیت اور انکار، انسانی ارتقاء کو تسلیم کرنے میں بخل کا درجہ رکھتے ہیں!

لیکن قدیم علومِ اسلامیہ کو فرسودہ قرار دینا اور مذہبی روایات کے حاملین کو دَقیانوس بتانا اُمت کی تباہی کا سبب ہے۔

غیر مذاہب کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کرنا اسلامی اَقدار کے منافی ہے!

لیکن دینِ اسلام پر غیر مذاہب کے حملوں کا دفاع نہ کرنا اور اسلام کی تبلیغ کا فریضہ سرانجام نہ دینا حمیت دینی اور غیرتِ اسلامی سے یکسر انحراف ہے۔

تبلیغ دین اور اشاعت اسلام میں حکمتِ عملی کو نظر انداز کر دینا مصالح دینیہ کے خلاف ہے!

لیکن حلال اور حرام کے امتیاز میں رَواداری برتنا اور قوانین و مسائل اسلامیہ کو نرم کر دینا اسلامی روح کو کمزور کر دینے کے مترادف ہے۔

آئین و سیاست سے بیگانہ ہر کر عبادت کیلئے گوشہ نشین ہو جانا زندگی سے فرار ہے!

لیکن جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی۔

جاہل کو دور ہی سے سلام کر دینا عبادِ صالحین کے اَوصاف میں داخل ہے!

لیکن جاہلیت کو مٹانا اور باطل کا تعاقب کرنا عین جہاد ہے۔

اگر آپ ایسا منصفانہ اور معتدلانہ رویہ پسند کرتے ہیں تو

ماہنامہ محدث لاہور

کا مطالعہ فرمایئے، آپ اس کو ان جملہ صفات و محاسن سے مزین پائیں گے، ان شاء اللہ! کیونکہ اس کے مضامین اسی مخصوص طرزِ فکر کے حامل ہوتے ہیں۔

فہرست

فکر و نظر

اسلام یا جمہوریت؟

مؤقر معاصر ''زندگی'' نے اپنے شمارے (۲۷ستمبر تا ۱۳اکتوبر ۱۹۷۱ء) کے ادارتی کالموں میں جمہوریت کا نعرہ بلند کرنے والوں کی تائید اور جمہوریت کو اسلام سے علیحدہ نظام قرار دینے والوں کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پاکستان کی بقاء اور اس کے استحکام کا انحصار صرف جمہوریت پر ہے اور جمہوریت اسلام ہے اور اسلام تک پہنچنے کا ایک ذریعہ بھی۔ ملخصاً

سالِ رواں کے شمارہ جنوری میں انتخابات پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے مشورہ دیا تھا کہ:۔

''اسلام پسند اگر اسلام کا نعرہ لگاتے ہیں تو صحیح اسلام پیش کریں یہ نہ ہو کہ سب کچھ سلام کے لئے کرنے کے بعد منزل اس سے ہٹ کر مغرب ہو یا مشرق۔''

ہمیں بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد مغربی یا مشرقی سامراج کے زیرِ اثر رہنے اور صحیح اسلامی تعلیمات سے محروم ہونے کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ اسلامی نظامِ حیات کے مختلف حصوں سے نابلد ہے بلکہ سامراج کی ذہنی اور فکری غلامی میں مبتلا ہو کر لادین نظاموں کو کسی نہ کسی طریقہ سے اسلامی ثابت کر کے ترقی پسندی میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے میں کوشاں ہے۔ اس کے لئے کبھی تو غیر اسلامی مادی نظاموں کی من مانی تعریفیں کر کے انہیں اسلامی کہا جاتا ہے اور کبھی اسلام سے جزوی مناسبتیں تلاش کرنے کی ناکام کوشش کی جاتی ہے۔ حالانکہ جس طرح صحیح اسلام وہ ہے جو کتاب و سنت میں ہے۔ اسی طرح جمہوریت و سرمایہ داریت اور اشتراکیت و آمریت کی صحیح تعبیریں صرف وہی ہیں جو ان کے بانیوں کے بیانات اور ان کی کتابوں میں موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان نظاموں کا عملی وجود جہاں کہیں پایا جاتا ہے اسی شکل میں نافذ ہے، جس میں ان کے بانیوں نے پیش کیا ہے جن کی تفصیلات کو نظر انداز کر کے خیالی توجیہات سے ان بے خدا مادی نظاموں کو اسلامی قرار دینے کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ ان کے مفاسد سے تنگ آئے ہوئے لوگ اسلام س بیزار ہو رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بے خدا مادی نظام اور حدّ اعتدال سے بھٹکی ہوئی افراط و تفریط کی راہیں ہیں جن کی اسلام سے کوئی مناسبت نہیں۔ اسلام ان سے نہ صرف ہر لحاظ سے الگ ایک معتدل نظامِ زندگی ہے بلکہ اپنے نفاذ کے لئے بھی کسی دوسرے نظام کا محتاج نہیں کیونکہ اسلامی نظامِ حیات سب خوبیوں کا جامع اور ہر لحاظ سے مکمل ہے۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ اگر دنیا کے کسی نظام میں کسی خوبی کا وجود ممکن ہے تو وہ اسلام سے ہی مستعار ہے اس لئے ہمیں اس بات کی قطعاً ضرورت نہیں کہ ہم دوسرے نظاموں کی خوبیاں تلاش کر کے انہیں اسلامی ثابت کریں۔ اگر وہ چیزیں واقعی اسلام ہیں تو پھر ان کی اصطلاحات کی اسلام اپنی تفصیلات کے ساتھ نہ صرف نظری طور پر دنیا میں موجود ہے بلکہ عملی طور پر بھی دنیا میں انسانیت کی فلاح و بہبودگی کا واحد ضامن پا چکا ہے۔

جمہوریت کا مکمل طور پر مطالعہ کرنے سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ جس طرح سوشلزم اپنی رنگین مساوات کے نام پر اسلامی عدل و

مساوات سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا، اسی طرح جمہوریت، آزادی اور عوامی اقتدار کے نام پر کبھی اسلام نہیں بن سکتی۔ کیونکہ جمہوریت نہ صرف یہ کہ ایک مستقل مذہب کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ اس کی آزادی کے اصول اور عوامی اقتدار کا طریقہ کار بھی اسلام کے اصولوں اور طریقہ کار سے بلاکل مختلف ہے۔ کیونکہ جمہوریت (جس کا لازمہ سرمایہ داریت ہے) جہاں تک ایک فتنہ اباحیت اور آزادی کے نام پر پامالیٔ حقوق اور طبقاتی تقسیم جیسے مفاسد کا بڑا ذریعہ ہے۔ وہاں اسلام کی منضبط آزادی، فرد اور اس کے حقوق کا تحفظ کرتی اور اجتماعی مفادات کے حصول کی ضمانت دے کر طبقاتی اونچ نیچ کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر رکھ دیتی ہے۔ اسی طرح جمہوریت جہاں نام نہاد عوامی اقتدار کے زعم میں افتراق و انتشار کا بیج بوتی ہے وہاں اسلام صحیح نمائندہ حکومت کا انتخاب کر کے ملکی استحکام اور عوامی اتحاد و اخوت کا باعث بنتا ہے۔ دنیا میں سیاسی طور پر حکومت اور عوام کے اختیارات کے توازن کے لئے آمریت اور جمہوریت کی ایک جنگ جاری ہے جب مادہ پرست جمہوریت میں انتشار اور ابتری دیکھتے ہیں تو استحکام کے نعرہ میں آمریت کو قبول کر لیتے ہیں پھر جب اس استحکام کی آڑ میں کوئی آمر مطلق العنان بن بیٹھتا ہے اور ظلم و استبداد کے ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے تو پھر آزادی کے نام پر جمہوریت کا رونا روتے ہیں۔ غرض بے چینی اور بے اطمینانی کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتا۔ اور یہی وہ صورتِ حال ہے جو اسلام اور خدائی نظامِ زندگی سے بغاوت کا نتیجہ ہے۔

معاصر موصوف نے سیاسی زندگی کو جس طرح آمریت اور جمہوریت کے دو نظاموں میں بند کرنے کی کوشش کی ہے اور اسلام کو جمہوریت قرار دے کر اسے صرف آمریت کے مدمقابل کھڑا کیا ہے اس سے وہ خود ذہنی انتشار میں مبتلا ہو گئے ہیں جیسا کہ وہ جمہوریت کے بہت بڑے داعی ہونے کے باوجود گزشتہ آزادانہ انتخابات کو فسطائیت کا سبب قرار دیتے ہیں اور پھر اس الزام سے بچنے کے لئے کہ یہ فسطائیت انتخابات سے قبل ملنے والی جمہوری آزادی ہی کا نتیجہ ہے انہوں نے اس کی ذمہ داری گیارہ سالہ آمریت پر ڈال دی ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ گیارہ سالہ آمریت کس کا نتیجہ تھی کیا وہ پہلی گیارہ سالہ جمہوریت کا تحفہ نہ تھی؟ نیز یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر بقول شما، آمریت سے حالات ایسے ہی ابتر ہو چکے ہیں کہ اس کے بعد ملنے والی تھوڑے عرصہ کی آزادی نے فسطائیت کو مسلط کر دیا ہے تو کیا اب اگر فسطائیت ابھارنے والوں کے ہاتھوں میں پاکستان کی باگ دوڑ دے دی جائے تو کیا ملک باقی رہ جائے گا؟ ہمارا ایمان ہے کہ ملک کی بقاء اور استحکام کا انحصار اسلام اور صرف اسلام پر ہے۔ لہٰذا اس وقت ہم سب کی مشترکہ کوششیں جمہوریت و اشتراکیت کی بجائے اسلامی آئین و دستور کے نفاذ کیلئے وقف ہونی چاہئیں جس کے بعد ملک کا نظم و نسق صحیح نمائندہ اسلامی حکومت کے سپرد کیا جا سکے۔

شعبان المعظم

شعبان کے روزے:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جس قدر روزے ماہِ شعبان میں رکھتے کسی اور مہینے میں نہ رکھتے تھے۔ تقریباً پورا مہینہ روزے سے رہتے۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم میں مختلف الفاظ سے بیان ہوئی ہے۔ ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

كَانَ يَصُوْمُه اِلَّا قَلِيْلًا بَلْ كَانَ يَصُوْمُه كُلَّه ۔

(آپ ﷺ شعبان کا اکثر حصہ بلکہ پورا مہینہ روزے رکھتے)

حضرت اُم سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بیان کردہ ایک حدیث میں یوں ہے کہ آپ ﷺ رمضان کے علاوہ شعبان کے بھی روزے رکھتے اور اس رمضان کے ساتھ ملاتے اس کے سوا کسی دوسرے پورے مہینے کے روزے نہ رکھتے" ابن ماجہ کی ایک روایت کے الفاظ ہیں۔

كَانَ يَصُوْمُ شَعْبَانَ وَرَمَضَانَ

(حضور اکرم ﷺ پورے شعبان اور رمضان کے روزے رکھتے)

یہی حدیث ترمذی نے بیان کرکے اسے "حسن" قرار دیا ہے۔

شبِ برات:

نصف شعبان کی رات کی فضیلت کے متعلق بیہقی وغیرہ نے بعض احادیث لکھی ہیں۔ اس رات کو نوافل ادا کرنے اور دن کو روزہ رکھنے اور ذکر و اذکار کے متعلق منذری رحمہ اللہ نے "ترغیب وترہیب" میں احادیث درج کی ہیں۔

چراغاں و آتشبازی:

ہمارے ملک میں یہ رسم ہے کہ اس رات کو گھروں میں اور دیواروں پر چراغ جلاتے ہیں اور آتشبازی کرتے ہیں، یہ ایک بہت بڑی بدعت ہے۔ جس کی کوئی بنیاد نہیں بلکہ اس کا گناہ کبیرہ ہونا ثابت ہے۔ کیونکہ یہ رات قیام وذکر اور دن روزے کے لئے خاص ہے اب اس کی ضد میں اس رات کو لہو ولعب میں مشغول ہونا یقیناً بہت بڑا جرم ہے۔ یہ رسم ہمارے ملک کے سوا کسی اور ملک میں نہیں پائی جاتی۔ یہاں ہندوؤں کی دیوالی کو دیکھ کر مسلمانوں نے اس طرح چراغاں کرنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے چراغاں کرنے والے "برامکہ" تھے۔ مسلمان جہلاء نے آتش پرست مجوسیوں اور ہندوؤں سے اس رسم کو حاصل کرکے اپنایا۔ فَمَا اَشْبَهَ اللَّيْلَةَ بِالْبَارِحَةِ ۔

عورت نکاح میں ولی کی محتاج کیوں ہے؟

حضرت مولانا محمد صاحب کنگن پوری قسط نمبر ۴ (آخری)

عورت کا بغیر ولی کے نکاح نہ ہونے پر صحابہ کرام کا اجماع:

دلائل شرعیہ میں اصل قرآن وحدیث ہی ہیں سو وہ مسئلہ مذکورہ کے بارے میں بیان کر دیئے گئے ہیں۔ اب مومنِ متبعِ قرآن وحدیث کیلئے کسی دلیل کا انتظار باقی نہیں رہنا چاہیئے۔ تاہم مختصر طور پر صحابہؓ کا ذِکر کر دینا بہتر ہو گا۔

بعض صحابہؓ سے نصاً صراحتاً ثابت ہے کہ ولی کے بغیر عورت کا نکاح جائز نہیں اور وہ اس میں بڑے متشدد تھے اور بعض سے اگرچہ صراحتاً مذکور نہیں لیکن ان سے اس کا خلاف بھی ثابت نہیں کتب احادیث سے امیر المومنین عمر بن الخطابؓ کا اس مسئلہ میں تشدد ملاحظہ فرمائیں۔

منتقیٰ للمجد ابن تیمیہ میں ہے:

وعن عكرمة بن خالد قال: جمعت الطريق ركباً فجعلت امرءة منهن (ثيب) امرها بيد رجل غير ولى فانكحها فبلغ ذلك عمر فجلد الناكح والمنكح وردّ نكاحها (رواه الشافعي والدار قطني)

"امام شافعیؒ نے اپنی مسند اور امام دار قطنیؒ نے اپنی سنن میں عکرمہ بن خالد سے روایت کیا ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ رستہ میں کچھ اونٹ سوار مسافر اکٹھے ہو گئے جن میں سے ایک بیوہ عورت نے ایک غیر ولی شخص کو اپنے نکاح کا اختیار دے دیا جس پر اس نے اس عورت کا نکاح کر دیا۔ جب یہ بات حضرت عمرؓ کو پہنچی تو انہوں نے نکاح کرنے والے اور کرانے والے دونوں کو دُرّے لگوائے اور اس عورت کا نکاح توڑ دیا۔"

اور موطا امام مالک ص ۴۳۶ میں ہے:

قال عمر بن الخطاب لا تنكح المرءة الا بأذن وليها او ززدى الراى من اهلها او السلطان

"سعیدؒ بن المسیب سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا عورت کا نکاح نہ کیا جائے مگر ولی کے اذن سے یا اس کے کنبے کے عقل مند کے اذن سے یا بادشاہ کے اذن سے (اگر اس کا کوئی ولی نہ ہو)"

اور جامع رمذی ص ۱۷۷ میں ہے:

والعمل فى هذا الباب على حديث النبى ﷺ لا نكاح الا بولى عند اهل العلم من اصحاب النبى ﷺ منهم عمر بن الخطاب وعلى بن ابى طالب وعبد الله بن عباس و ابو هريرة وغيرهم وهٰكذا روى عن بعض فقهاء التابعين انهم قالوا لا نكاح الا بولى منهم سعيد بن المسيب والحسن البصرى وشريح وابراهيم النخعى وعمر بن عبد العزيز وغيرهم وبهذا يقول سفيان الثورى والاوزاعى ومالك وعبد الله بن المبارك والشافعى واحمد واسحق!

"یعنی امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ صحابہؓ کرام کا عمل نبی ﷺ کی اسی حدیث لا نكاح الا بولى پر ہے جن میں عمر بن الخطابؓ، علیؓ ابن ابی طالب، عبد

اللہؓ بن عباسؓ ابو ہریرہؓ وغیر ہم ہیں اور بعض فقہاء تابعینؒ سے بھی یہی مروی ہے کہ بغیر ولی کے نکاح جائز نہیں۔ ان میں سے سعید بن المسیب، حسن بصری، شریح ابراہیم النخعی، عمر بن العزیز وغیر ہم ہیں اور سفیان ثوری، اوزاعی، مالک، عبد اللہ ابن مبارک، شافعی، احمد، اور اسحاق بھی یہی فرماتے ہیں۔"

اس بارت میں امام ترمذیؒ نے صحاہ کے ساتھ بض کا لفظ استعمال نہیں کیا اور فقہاء کے ساتھ بض کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس سے معلوم ہوا کہ صحابہ اس مسئلہ میں سب متفق ہیں۔

حضرت عائشہؓ اپنی بھانجیوں بھتیجیوں کے نکاح کا سارا معاملہ خود طے کر لیتی تھیں لیکن جب عقد نکاح کا وقت آتا تو کسی مرد کو بلا کر فرماتی تھیں کہ یہ تم کرو کیونکہ میں عورت ہوں اور عورت نکاح میں ولی نہیں ہو سکتی۔

اور جن صحابہ سے صراحتاً یہ مسئلہ مذکور نہیں ان سے بھی اس کا خلاف ثابت نہیں۔

چنانچہ سبل السلام میں ہے:

وحكى من ابن المنذر انه لا يعرف عن احد من الصحابة خلاف ذلك وعليه دلت الاحاديث

"یعنی ابن منذر فرماتے ہیں کہ کسی صحابی سے اس کا خلاف ثابت نہیں گویا صحابہ کا اس پر اجماع ہے۔"

نیز کتبِ حدیث صحاح ستہ میں یہ باب تو جابجا ملتا ہے کہ ولی کے بغیر نکاح جائز نہیں لیکن غالباً کسی محدث نے یہ باب نہیں باندھا کہ بغیر ولی کے نکاح جائز ہے۔ یہ اس پر دال ہے کہ محدثین کے نزدیک نکاح بغیر ولی کے جائز نہیں۔

میں اس وقت ایسے مقام پر ہوں کہ میرے پاس حوالہ کی کتابیں معدودے چند ہیں اور میں بیمار ہوں۔ ماہنامہ "محدث" کے شمارہ اکتوبر میں اس مضمون کا ختم کرنا ضروری ہے اس لئے میں فی الحال اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

حاصل یہ کہ مذکورہ دلائل قرآن و حدیث سے واضح ہو گیا کہ ولی کے بغیر کوئی نکاح جائز نہیں، نیز صحابہؓ بھی اس پر متفق ہیں اور کسی سے اس کا خلاف ثابت نہیں اور بعض تابعین سے بھی یہی مروی ہے جیسا کہ جامع ترمذی کی مذکورہ عبارت سے واضح ہے اور ائمہ ثلاثہ مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ کا بھی یہی فتویٰ ہے۔ باقی رہے بعض علماء حنفیہ وغیرہ تو ان کا قول قرآن و حدیث کے مقابلہ میں کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔

میں نے اپنے مضمون کے شروع میں عورتوں کے ناقص العقل وغیرہ ہونے کے الفاظ لکھے تھے۔ بعض مردوں کے شانہ بشانہ چلنے کا دعویٰ کرنے والی عورتیں شاید ان الفاظ کو اپنی توہین خیال کریں لیکن ایسے الفاظ قرآن و حدیث میں آئے ہیں۔ اور علماء نے اسرارِ شریعت بیان کرتے ہوئے اسی طرح لکھا ہے۔ چنانچہ میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی عبارت کا اردو ترجمہ پیش کرتا ہوں، جو میرے مضمون کی تائید ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ مترجم ج ۲ ص ۳۲۹ میں ہے:

"نبی ﷺ نے فرمایا کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔"

واضح ہو کہ نکاح کے بارہ میں تنہا عورتوں کو مختار بنانا درست نہیں ہے کیونکہ ان کی عقلیں ناقص ہوتی ہیں اور ان کا فکر بھی کمزور ہوتا ہے۔ پس بسا اوقات ان کو مصلحت معلوم نہیں ہوتی اور اکثر ان کو شرافت کا لحاظ نہیں ہوتا۔ پس بسا اوقات ان کو غیر کفو میں رغبت ہو جاتی ہے اور اس میں ان کی

قوم کو عار ہوتی ہے۔ اس واسطے ضروری ہوا کہ اس باب میں اولیاء کو بھی کچھ دخل ہو تا کہ یہ فساد بند ہو اور نیز ضرورتِ جبلّیہ کے اعتبار سے لوگوں میں عام طریقہ ہے کہ مردوں کو عورتوں پر اختیار ہوتا ہے اور ہر امر کا بندوبست انہیں کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور ان کے تمام اخراجات مردوں کے ذمہ ہوتے ہیں اور عورتیں ان کی مقید ہوتی ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس سبب سے کہ خدا نے بعض کو بعض سے افضل بنایا ہے اور اس وجہ سے بھی کہ وہ اپنے اموال میں سے خرچ کرتے ہیں۔"

اور نیز نکاح کے اندر ولی کی شرط لگانے میں مردوں کی عظمت ہے اور عورتوں کا نکاح میں خود مختار ہونا بے حیائی ہے جس کا مدار قلت یا پر ہے اور اولیاء کی مخالفت اور ان کی بے قدری پر ہے اور نیز یہ بات ضروری ہے کہ بہ سبب شہرت کے نکاح زنا سے ممیز ہو جائے اور شہرت کی عمدہ صورت یہ ہے کہ عورت کے اولیاء نکاح میں موجود ہوں۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

"شوہر رسیدہ عورت کا نکاح اس کے مشورہ کے بغیر اور باکرہ کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر نہ کیا جائے اور اس کی اجازت اس کا چپ ہو جانا ہے اور ایک روایت میں ہے باکرہ سے اس کا والد اجازت لے۔"

میں کہتا ہوں صرف اولیاء کو مختار بنانا ہی جائز نہیں ہے کیونکہ عورت اپنا نفع و نقصان جس قدر جانتی ہے وہ نہیں جانتے اور نیز نکاح کا نفع و نقصان خاص اسی کی طرف رجوع کرتا ہے، اور استیمار سے مراد عورت کے حکم کا صراحتاً طلب کرنا ہے اور استیذان سے مراد، اس سے اجازت طلب کرنا اور اس کا منع نہ کرنا ہے اور اس کا ادنیٰ مرتبہ سکوت ہے۔"

شاہ صاحب نے میرے مضمون کی پوری تائید فرمادی ہے کہ عورت ناقص و کمزور عقل ہے اکثر وہ اپنی مصلحت اور فائدہ کو نہیں سمجھتی لہٰذا وہ ولی کے بغیر نکاح نہ کرے۔ نیز ولی بھی اس کی اجازت اور پسند بغیر نکاح نہ کرے جیسا کہ میں نے اپنے مضمون میں ذِکر کر دیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

الحاصل

جو نکاح بھی بغیر اجازت یا شرکت ولی کے کیا جائے وہ شرعاً نکاح نہیں ہوتا بلکہ وہ زنا کے حکم میں ہے۔ سول میرج کا یہی حکم ہے۔

تنبیہ:

اگر شریعت کی پوری پابندی کی جائے تو غلط کاریاں ظہور پذیر نہیں ہوتیں۔ یعنی اولیاء اگر پوری اسلامی ہدایات پر عمل کریں تو عورتیں غلط کاری اختیار نہ کریں۔ اولیاء پر فرض ہے کہ لڑکی لڑکا جوان ہوتے ہی ان کی شادی کا انتظام ان کی پسند کے مطابق کر دیں تو ان شاء اللہ اکثر بدکاری تک نوبت نہ پہنچے گی۔ اولیاء اکثر غفلت برتتے ہیں۔ یا کوئی طمع کرتے ہیں یا کسی قسم کی خود غرضی مقصود ہوتی ہے تو نکاح میں دیر کرتے ہیں۔ اس طرح عورتیں تنگ آجاتی ہیں اور بدکاری میں پھنس جاتی ہیں۔ اگرچہ بدکاری کے اور بھی کئی اسباب ہیں لیکن یہ بھی ایک بڑا سبب ہے لہٰذا اولیاء کو اس کا بہت خیال رکھنا چاہئے ورنہ وہ ولی مرشد (خیر خواہ) نہ رہیں گے اور حدیث میں ولی کا مرشد ہونا آیا ہے لہٰذا ایسے حالات میں عورت کو اپنا نکاح خود کرنے یا بدکاری

کی طرف پڑنے کی بجائے دوسرے اقرب اولیاء کو توجہ دلانی چاہئے۔ اگر کوئی اسے بے باکی پر محمول کرے تو اسے سوچنا چاہئے کہ یہ اس بے حیائی سے بہت کم ہے جو مردوں کے ساتھ بھاگ جانے اور دوسرے غلط راستوں سے اسے اختیار کرنی پڑتی ہے جبکہ مذکورۃ الصدر بے باکی شریعت کی نظر میں جائز بلکہ مستحسن ہے۔

عورت کے اولیاء کی بلحاظ رتبہ تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ باپ یا بیٹا علی الاختلاف۔ ۲۔ بھائی۔ ۳۔ چچا۔ ۴۔ بھتیجا وغیرہ

اسی ترتیب سے جس ترتیب سے وہ وارث ہوتے ہیں۔ ذوی الارحام ماموں وغیرہ کے متعلق اسی طرح اختلاف ہے جس طرح وراثت میں ہے۔

آخری ولی، برادری کا سربراہ یا حاکم ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:

السلطان ولی من لا ولی له یعنی حاکم اس کا ولی ہے جس کا کوئی ولی نہیں۔

ولی کے بغیر عورت کا نکاح اب کئی مختلف صورتیں اختیار کر گیا ہے۔ مثلاً عدالتی نکاح (سول میرج) وغیرہ ان سب کا حکم ایک ہی ہے۔ اس لئے حیلے بہانے تلاش کرنے کی بجائے خدا تعالیٰ سے ڈرنا چاہئے۔

هذا ما عندی والله عنده حسن الصواب

اصلاح معاشرہ کا اسلامی تصور

پروفیسر خالد علوی (ایم اے۔ ایم او ایل) ترتیب واختصار: اکرام اللہ ساجد کیلانی قسط نمبر ۲ (آخری)

سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو، جلد ا: ۲،۳ برائے جنوری، فروری ۱۹۷۱ء

فکر و نظر کا بگاڑ:

انسانی زندگی چونکہ بنیادی طور پر نظریات پر استوار ہے، اس لئے نظریات و افکار میں بگاڑ انسان کی پوری سیرت و کردار کو متاثر کرتا ہے۔ جب ہم کسی معاشرے کا تجزیہ اس پہلو سے کرتے ہیں تو اس میں افراد کی نظریاتی و فکری کیفیتوں کو سامنے رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

فکری بگاڑ میں سب سے پہلی زد انسان کی اپنی شخصیت پر پڑتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ افراط و تفریط کا شکار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا کبھی تو وہ اپنے متعلق غلط فہمی کا شکار ہو کر ''انا ربکم الاعلی'' کا نعرہ لگاتا ہے۔ اور کبھی اپنے آپ کو مرتبۂ انسانیت سے بھی گرا کر، اپنی ہی جیسی مخلوق کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا ہے (قرآن پاک نے انسان کی اس ذہنی کیفیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

''اولئك كالانعام بل هم اضل-''

''یعنی یہ لوگ انسان ہونے کے باوجود حیوانوں سے بھی گئے گزرے ہیں کہ جنہیں اپنی حیثیت کا احساس تک بھی نہیں)''

انسان کی یہ روش اس کے غلط طرزِ فکر کا ہی نتیجہ ہے جس میں انکارِ خدا، شرک، انکارِ آخرت، خیر و شر کی تمیز سے انکار، بامقصد زندگی سے انکار اور انسان کی اصل حیثیت اور مرتبہ سے انکار سب شامل ہیں۔ فکر و نظر کے اس بگاڑ سے انسانی زندگی کے جملہ احوال متاثر ہوتے ہیں اور اس کا اثر معاشرے کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر غالب ہوتا ہے۔

اب ہم مختصر طور پر فکر و نظر کے بگاڑ کی مندرجہ بالا صورتوں کا جائزہ لیں گے۔

انکارِ خدا:

ایک غلط طرزِ فکر کا حامل ذہن جب کائنات اور اپنی زندگی کے متعلق سوچتا ہے۔ تو اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ تخلیق کائنات کا کوئی مقصد نہیں اور نہ ہی کائنات کا کوئی خالق ہے اور اگر ہے تو بھی انسانی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اس بیہودی و بے راہ ذہن کی نظر میں انسان کی حیثیت ایک جاندار مخلوق سے زیادہ نہیں جس کی پیدائش کسی خاص حادثہ کا نتیجہ ہے اور جس کا نظام یات بھی کسی حادثہ ہی کا شکار ہو کر ختم ہو جائے گا۔

اس کے خیال میں انسان کا کوئی مالک، مختار اور حاکم نہیں جس کے سامنے وہ جواب دہ ہے اور نہ ہی اس کی نظر میں انسایت کے لئے کوئی سرچشمہ ہدایت موجود ہے، لہٰذا قانون بنانا، اپنی قوتوں کا مصرف تجویز کر کے انہیں بروئے کار لانا اور اپنے لئے راہِ عمل متعین کرنا اس کا اپنا کام ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ایک انسان جب اس طرزِ فکر کو اپنا کر اپنی عملی زندگی میں قدم رکھے گا تو لامحالہ غلط طرزِ عمل اختیار کرے گا اور یہ چیز لازمی طور پر ایک غلط معاشرہ

کی تشکیل و تعمیر پر منتج ہو گی۔ نظریہ انکار خدا کا اگر ہم تجزیہ کریں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ اس کی وجہ سے انسان کی انفرادی زندگی کے ساتھ ساتھ، اس کی اجتماعی زندگی بھی متاثر ہوتی ہے کیونکہ انفرادی زندگی میں جب انسان خود ہی اپنے لئے راہِ عمل اختیار کرے گا، خود ہی قوانین مرتب کرے گا، خود ہی اصولِ زندگی وضع کرے گا۔ اور اپنی خواہشاتِ نفسانی اور مقتضائے جسمانی کا حل اپنے ہی ذہن سے تلاش کرے اتو نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ ایک خود غرض، مادہ پرست، ابن الوقت اور عملی طور پر بالکل ایک شتر بے مہار کی طرح ہو جائے گا کہ جو راہ چاہے اپنے لئے متعین کرے اور جو بھی طرزِ عمل چاہے اختیار کرے۔

چنانچہ جب ایسی انفرادی زندگی، اجتماعی طرزِ حیات کا رنگ اختیار کرے گی، تو نتیجہ یہ ہو گا کہ سیاست کی بنیاد انسانی حاکمیت پر ہو گی، تمام اصول و قوانین، خواہشات اور تجرباتی مصلحتوں کی بناپر وضع کئے جائیں گے۔ بااختیار و اقتدار وہی لوگ سمجھے جائیں گے، جو طاقتور اور چالاک ہوں گے۔ سوسائٹی کی راہ نمائی ان لگوں کے ہاتھ میں ہو گی جو مکار، جھوٹے، داباز، سنگدل اور خبیث النفس ہوں گے۔ جن کی کتابِ آئین میں طاقت کا نام حق و صداقت اور کمزوری، محرومی اور بیچارگی کا نام باطل ہو گا۔ غرض معاشرت اور طرز تمدن کا پورا نظام نفس پرستی پر قائم ہوا اور اجتماعیت چند آوارہ مزاج لوگوں کے لئے ایک منظم چراگاہ ہو گی۔

شرک:

انکارِ خدا کے بعد فکری بگاڑ کی دوسری وجہ شرک ہے۔

ایسے لوگ یقیناً کم ہوں گے جو خالقِ عالم اور قادرِ مطلق کے وجود کے منکر ہوں گے لیکن ایسے لوگ بکثرت مل جائیں گے جو شرک کی بھول بھلیوں میں سرگرداں ہیں۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کو مبعوث فرما کر مشرکین کے خلاف حجت قائم فرمادی ہے۔ لیکن بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ کچھ وجود، خدا کی صفات و اختیارات میں کسی نہ کسی طرح شریک ہیں، باوجودیکہ قرآن مجید نے شرک کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر رکھ دیا ہے۔

شرک کے تصور کے زیرِ اثر انسان جو طرزِ عمل اختیار کرتا ہے۔ اس سے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی متاثر ہوتی ہے۔ انسان کی پوری زندگی اوہام کی آماجگاہ بن جاتی ہے وہ اچھے اثرات کی موہوم امید وار برے اثرات کے خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنی بہت سی قوتیں لاحاصل طریقے سے ضائع کر دیتا ہے۔ کبھی کسی قبر سے امید لگاتا ہے، کبھی بتوں پر بھروسہ کرتا ہے، کبھی کسی برے شگون سے دل برداشتہ ہو جاتا ہے اور کبھی خیالی قلعے تعمیر کرتا ہے، غرضیکہ شرک انسان کو فطری طریقے سے ہٹا کر غیر فطری راستے پر لا ڈالتا ہے اور انسان کی زندگی میں پوجا پاٹ، نذر و نیاز اور دوسری غیر شرعی رسموں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جس میں الجھ کر انسان کی سعی و عمل کا ایک حصہ بے نتیجہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ چالاک لوگ مشرکانہ توہم پرستی کے جال میں لوگوں کو پھانس کر لوٹ کھسوٹ شروع کر دیتے ہیں، شرکیہ عقیدے کی بدولت عام انسانوں کی گردنوں پر شاہی خاندانوں، روحانی پیشواؤں اور مذہبی عہدہ داروں کی خدائی کا جواء مسلط ہو جاتا ہے۔ اس سے نہ تو علوم و فنون ہی ترقی پاتے ہیں اور نہ ہی درست فلسفہ،

صالح ادب اور تمدن وسیاست کے لئے فضا ہموار ہوتی ہے۔ انسانیت گمراہی اور دھوکے کا شکار ہوکر خود اپنے ہی خلاف جنگ کرنا شروع کر دیتی ہے، اور بالآخر انہی راہوں پر گامزن ہو جاتی ہے جن کا ذکر انکارِ خدا کے ضمن میں کیا گیا ہے۔

انکارِ آخرت:

انکارِ آخرت بھی، انکارِ خدا اور شرک ہی کی ایک کڑی ہے۔

آخرت اصل میں نام ہے اعمال وافعال کے اس نتیجے کا جو اس دنیا میں ہم کر رہے ہیں اور اگر جزا وسزا کا تصور سرے سے ذہن میں موجود ہی نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ نیکی صرف دنیاوی فوائد اور برائی صرف دنیاوی نقصانات تک محدود ہو کر رہ جائے گی۔ ان حالات میں انسان کی حالت دو حال سے خالی نہ ہو گی۔ حالات ناموافق ہوں گے۔ تو نیکوکاری کے نتائج ظاہر نہ ہونے پر اس کی قوتِ عمل سرد پڑ جائے گی اور وہ برائی کی طرف مائل ہو جائے گا اور سازگار حالات کی صورت میں انسان نفس پرست بن جائے گا۔ اور دنیاوی خواہشات ولذات حاصل کرنے کے لئے جائز وناجائز ذرائع کا استعمال شروع کر دے گا۔ اور یہ دونوں صورتیں انسانیت کی تباہی کا سبب بن سکتی ہیں۔ یہ تو رہا انفرادی زندگی کا ماملہ اور اگر کہیں پوری سوسائٹی کے افعال واعمال کا دارومدار اسی اعتقاد پر ہو تو پورا معاشرہ خود غرضی اور نفسانیت کی لپیٹ میں آئے گا۔ اور ایسے معاشرہ کے انجام کا تصور کرنا کچھ مشکل نہ ہو گا۔

بامقصد زندگی سے انکار:

جب تک انسان کے سامنے کوئی واضح لائحہ عمل اور نصیب العین نہ ہو گا۔ انسان کا کوئی عمل بھی تنظیم وانضباط سے ہمکنار نہ ہو سکے گا۔ اور اس کی زندگی صرف کھانے پینے اور خواہشات سے متمتع ہونے سے عبارت ہو کر رہ جائے گی۔ اور یا پھر کوئی انتہا پسند یا کوئی سر پھرا انسان جو اپنے آپ کو پیدائشی مجرم تصور کرتا ہے، اس جرم کی سزا بھگتنے کے لئے خواہشات ولذّات سے بالکل ہی کنارہ کش ہو جائے گا۔ اور ایک بامقصد زندگی گزارنے کی بجائے بیابانوں اور ویرانوں کی خاک چھانتا نظر آئے گا۔ لیکن اسلام کا تصورِ حیات ان ہر دو صورتوں سے بیزار ہے۔ وہ تو انسان کو صحیح مقصدِ حیات سے ہمکنار کرنے کی خاطر ایک مبنی بر اعتدال وتوازن راست پر چلنے کے لئے زور دیتا ہے۔ وہ انسان کو ایک ایسا اچھوتا نظام حیات بخشتا ہے جو انسانیت کے لئے ہر طرح سے اطمینان وتسکین کا حامل ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جہاں ایک مقام پر اپنے نیک بندوں کی پسندیدہ حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ:

قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی لله رب العالمین ۔

(یعنی میری نماز قربانی اور زیات ومما ت سب اللہ ہی کے لئے ہیں)

وہیں ایک دوسرے مقام پر یہ بھی ارشاد فرمادیا ہے کہ:

ومن الناس من یعبد الله علی حرف فان اصابه خیر ن اطمأنّ به وان اصابته فتنة ن انقلب علی وجهه خسر

الدنیا والاخرہ ذالك هو الخسران المبين

"کچھ آدمی اللہ کی بندگی کنارے پر کرتے ہیں پھر اگر وہ بھلائی سے ہمکنار ہوئے تو اطمینان پاتے ہیں اور اگر کوئی آزمائش آپڑی تو منہ کے بل پلٹ گئے۔ یہ تو دنیا اور آخرت دونوں کا گھاٹا ہے اور صریح نقصان۔"

آپ انسان کی ان ہر دو حالتوں کو جائزلیجئے اور اس کے بین بین ایک راہِ اعتدال متعین کر لیجئے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اسلام کی نظر میں با مقصد زندگی کا شعور اور اعلیٰ اور ارفع معیارِ حیات کا تصور کیا ہے۔ اور پھر اس بات کا سمجھنا بھی کچھ مشکل نہ ہو گا کہ اس معیارِ حیات کے تصور سے منحرف ہونے والے افراد یا معاشرہ کبھی پنپ نہیں سکتے۔

خیر وشر کی تمیز سے انکار:

خیر کے معنی بھلائی کے ہیں اور شر اس کی ضد ہے، خیر سے مراد وہ چیز ہے جو انسان کے لئے انفرادی یا اجتماعی افادیت کی حامل ہو۔ یہ افادیت مادی بھی ہو سکتی ہے اور روحانی بھی، دنیوی بھی اور اخروی بھی۔ اور شر سے مراد وہ چیز ہے جو انسان کے لئے انفرادی یا اجتماعی رنگ میں ضرر رساں ہو، جس معاشرہ میں خیر وشر کی تمیز مٹ جائے (خیر اور شر کا معیار وحی الٰہی اور احکام قرآنی پر رکھا جائے گا) وہ ضلالت اور گمراہی کا شکار ہو جاتا ہے کیونکہ افراد کی نظر میں نیکی نیکی اور بدی بدی نہیں رہتی اور لوگ صرف ظاہری منفعتوں کے زیر اثر کام کرتے ہیں۔ ایسی قوم اور ایسے معاشرے کا زوال یقینی اور حتمی ہو جاتا ہے۔

معاشرے کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ اگر اس میں ایسے لوگ بچ بھی جائیں۔ جو خیر وشر میں تمیز کر سکتے ہوں تو بھی شر کے غلبے، معاشی لوٹ کھسوٹ اور اخلاقی اقدار کو مٹتے دیکھ کر ہمت ہار بیٹھیں اور کنارہ کشی اختیار کر لیں۔ ایسے حالات میں اصلاح کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں رہتی اور بالآخر معاشرہ تباہی اور بربادی کا شکار ہو جاتا ہے۔

یہ ہیں وہ محرکات اور وجوہات جو فکر و نظر میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں۔ لہٰذا ایسی کیفیت سے معاشرے کو بچانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان کا مقصدِ زیست تعمیری اور اخلاقی ہو۔ وہ خدا، آخرت اور بامقصد زندگی پر ایمان رکھے۔ اور شرک سے اپنا دامن ملوث نہ ہونے دے۔

قول وفعل کا بگاڑ:

فکر و نظر کا بگاڑ قول و فعل کے بگاڑ کی بنیاد ہے کیونکہ انسان کا کردار نظریات کے خمیر سے اُٹھتا ہے۔ ماحول اور حالات اسے پختہ کر دیتے ہیں اور انسان کی اپنی کوشش اسے پائیدار بنا دیتی ہے۔ قول و فعل کے بگاڑ میں بے شمار چیزیں گنوائی جا سکتی ہیں لیکن قرآن پاک نے خیر شر کے جملہ پہلوؤں کو بڑی جامعیت کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔

ان الله يأمر بالعدل والاحسان وايتاء ذى القربىٰ وينهىٰ عن الفحشاء والمنكر والبغى يعظكم لعلكم تذكرون

"بیشک اللہ تعالیٰ عدل واحسان اور قریبیوں کے حقوق کی ادائیگی کا حکم دیتا ہے اور فحشاء، منکر اور بغی سے روکتا ہے، اللہ تمہیں نصیحت فرماتا ہے، تاکہ تم

نصیحت مانو"

مندرجہ بالا آیت میں تین قسم کی برائیاں بیان کی گئی ہیں اور وہ ہیں۔ الفحشاء، المنکر اور البغی، اب ہم تھوڑی سی بحث اس بات پر کریں گے، کہ فحشاء، منکر اور بغی میں کون کون سی چیزیں شامل ہیں۔

الفحشاء:

یہ لفظ فحش سے نکلا ہے۔ الفواحش اس کی جمع ہے۔ جس کے معنی حدود فراموشی کے ہیں۔ زیادتی کر بیٹھنا، کسی بات سے تجاوز کرنا، گفتگو میں ادب واحترام کی حدود کو پھلانگ جانا (وغیرہ) بھی شاءہی کے ضمن میں آتا ہے۔

قرآن کریم میں فحشاء کے مقابلے میں عدل کا لفظ آیا ہے۔ لہٰذا فحش کے معنی حدودِ خداوندی سے تجاوز اور سرکشی کے ہیں، سورۃ الانعام میں ہے:

ولا تقربوا الزنٰی انه کان فاحشة وساء سبیلا ۔

" اور بدکاری کے پاس نہ جاؤ بیشک وہ بے حیائی اور بری راہ ہے۔"

عورتوں کے زمن میں فاحشہ کا لفظ زنا کے لئے استعمال ہوا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے:

ولا تقربوا الفواحش ما ظهر منها وما بطن

"تم فواہش کے قریب نہ جاؤ خواہ وہ کھلے ہوں یاڈھکے چھپے"

غرض قرآن پاک میں فحش کا لفظ مختلف جگہوں پر مختلف معانی میں آیا ہے۔ نیز لفظ فواہش اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ فاحشہ صرف زنا ہی نہیں بلکہ دوسرے بے حیائی کے کام بھی فاحشہ میں شامل ہیں۔ سعت کے ساتھ اس کا اطلاق فحش گوئی اور فحش کاری پر ہوتا ہے جس کی ہر نوع سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو باز رہنے کی تاکید فرمائی ہے۔

المنکر:

فحشاء کے بعد جس چیز سے باز رہنے کی تاکید کی گئی ہے وہ منکر ہے۔ اس کے لغوی معنی ناشناسا کے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں معروف (شناسا) کا لفظ آیا ہے۔ جو کام ہر طبقہ میں ناپسند کیا جاتا ہے اور جس کا مرتکب سب کی نگاہوں میں گر جاتا ہے اس کو منکر کہا جاتا ہے۔

رزائل کے لئے قرآن پاک میں سب سے عام لفظ منکر ہے۔ چنانچہ سورۃ المائدہ میں جن برائیوں سے روک ٹوک نہ کرنے پر بنی اسرائیل کو ملامت کی گئی ہے ان کو اسی لفظ منکر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

کانوا لا یتناهون عن منکر (المائدہ:۷۹)

"وہ ایک دوسرے کو برائی سے منع نہ کرتے تے۔"

شیطان کی پیروی کو بھی فحشاء اور منکر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یا ایھا الذین آمنوا لا تتبعوا خطوت الشیطن ومن یتبع خطوت الشیطن فانه یامو بالفحشاء والمنکر (النور:۲۱)

"اے ایمان والو شیطان کے نقش قدم پر مت چلو اور جس نے ایسا کیا بیشک وہ بے حیائی اور برائی کا حکم دیتا ہے۔"

عرض المنکر ایک ایسا وسیع لفظ ہے جو ہر قسم کی برائیوں، بے حیائیوں، ناپسندیدہ اور غیر مانوس افعال کو محیط ہے اور اس سے بھی اجتناب کرنے کی قرآن مجید نے پرزور تاکید فرمائی ہے۔

البغی:

ابن کثیر بغی کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

فاما البغی فھو عدوان علی الناس (ابن کثیر ج۲ ص ۸۲)

"یعنی لوگوں پر ظلم وزیادتی "بغی" ہے۔"

قرآن مجید میں ہے: خصمان بغی بعضنا علی بعض

"ہم دو جھگڑنے والوں نے ایک دوسرے پر زیادتی کی ہے"

ابن فارس نے اس کے دو معنی بیان کئے ہیں۔

۱۔ کسی چیز کی طلب میں میانہ روی کی حد سے بڑھنے کی کوشش کرنا۔

۲۔ بگڑ جانا۔ مطلق طلب کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ جیسے ابتغاء رحمۃ۔

''فئة باغية'' اس جماعت کو کہتے ہیں جو حدود شکنی کرے اور نظام حکومت کے خلاف اٹھ کھڑی ہو۔

سورہ مریم میں "بغیّا" کا لفظ بدکاری کے معنوں میں آیا ہے۔

قالت انی یکون لی غلام ولم یمسسنی بشر ولم اك بغیا

"بولیں کہ میرے ہاں لڑکا کیسے پیدا ہو گا مجھے تو کسی آدمی نے ہاتھ نہیں لگایا اور نہ میں بدکار ہوں۔"

ان یکفروا بما انزل الله بغیا (البقرہ:۹۰)

"یعنی جو کچھ اللہ نے اتارا ہے اس سے انکار کرتے ہیں، ضد کی وجہ سے۔"

مذکورہ بالا آیات سے البغی کے جو معانی علم میں آتے ہیں وہ ہیں، لوگوں پر ظلم وزیادتی کرنا، میانہ روی کی حد سے بڑھنے کی کوشش کرنا، کسی چیز کی طلب کے لئے انتہائی کوشش کرنا۔ حدود شکنی کرنا، بغاوت کرنا، بدکاری کرنا، ناجائز ضد کرنا وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ بھی تمام ایسی چیزیں ہیں جن سے مجتنب رہنے کی قرآن مجید نے تلقین فرمائی ہے۔

ان قرآنی اصطلاحات سے جو نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ فحشاء میں جس برائی کا ذِکر کیا گیا ہے۔ وہ صرف ایک فرد کی ذات تک

محدود ہے۔ مثلاً زنا، برہنگی، جھوٹی تہمت، شراب نوشی، چوری وغیرہ، انہیں حدیث شریف میں بھی فواحش کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔

منکر میں پوری جماعت کی معاشرتی زندگی شامل ہوتی ہے۔ ایسی زندگی جو ناپسندیدہ افعال، غیر مانوس حرکات، ظلم و ستم، سنگدلی، برائیوں اور بے حیائیوں سے عبارت ہو۔ ''بغی'' میں ایسی برائیاں شامل ہیں جو جماعت سے بھی آگے بڑھ کر پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔ مثلاً چوری، قتل، ڈاکہ، بدکاری وغیرہ اور اس نوع کے دوسرے افعال جن سے اجتماعی زندگی متاثر ہوتی ہے۔

سید ابو الاعلیٰ مودودی کے الفاظ میں الفحشاء، المنکر اور البغی کی تعریف:

فحشاء کا اطلاق تمام بیہودہ اور شرمناک افعال پر ہوتا ہے۔ ہر وہ برائی جو اپنی ذات میں نہایت قبیح ہو، فحش ہے۔ مثلاً بخل، زنا، برہنگی و عریانی، فعل قوم لوط، محرمات سے نکاح کرنا، چوری، شراب نوشی، بھیک مانگنا، گالیاں بکنا، اور بدکلامی کرنا وغیرہ۔ اسی طرح علی الاعلان برے کام کرنا اور برائیوں کو پھیلانا بھی فحش ہے۔ مثلاً جھوٹا پروپیگنڈا، تہمت تراشی، پوشیدہ جرائم کی تشہیر، بدکاریوں پر اُبھارنے والے افسانے اور ڈرامے، فلم، عریاں تصاویر، عورتوں کا بن سنور کر منظرِ عام پر آنا۔ علی الاعلان مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط ہونا اور اسٹیج پر عورتوں کا ناچنا، تھرکنا اور جسم کی نمائش کرنا وغیرہ منکر سے مراد ہر وہ برائی ہے جس انسان بالعموم برا جانتے ہیں، ہمیشہ سے برا کہتے رہے ہیں اور تمام شرائع الٰہیہ نے جس سے منع کیا ہے۔

بغی کے معنی ہیں، حد سے تجاوز کرنا اور دوسرے کے حقوق پر دست درازی کرنا خواہ وہ خالق کے ہوں یا مخلوق کے۔

مندرجہ بالا بحث سے قول و فعل کے بگاڑ کی (الفحشاء، المنکر، البغی کے ضمن میں آنے والی) تمام صورتیں سامنے آجاتی ہیں اور یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ مذکورہ بالا خرابیاں ایسی ہیں جن کی بدولت افرادِ انسانی اور جماعتوں کو ہر وقت مادّی اور روحانی نقصان پہنچنے کا احتمال ہوتا ہے۔ جب یہ افعال کسی قوم میں جڑ پکڑ لیں اور ان پر گرفت کرنے والا کوئی نہ ہو تو پوری قوم اس کی لپیٹ میں آجاتی ہے اور سارا معاشرہ تباہی اور بربادی کا شکار ہو جاتا ہے۔ قوم کی دینی اور دنیوی ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور سعادت و اقبال کا دروازہ اس پر اس وقت تک کے لئے بند ہو جاتا ہے جب تک وہ اپنی اصلاح نہ کر لے۔

اصلاح:

جب ہم نے بگاڑ کا تعین کر لیا اور اس کے تفصیلی عناصر سے بھی واقفیت حاصل کر لی تو اب ہمارے لئے اصلاحی اقدام کا تعین بھی نہایت آسان ہے، مضمون کے آغاز میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ اصلاح نام ہے، دوستی یا ازالہ فساد کا۔ لہٰذا معاشرے میں جہاں جہاں بھی فساد ہو گا۔ اس کو درست کرنے کا نام اصلاح ہو گا۔

سب سے پہلے یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اسلام جہاں جماعتی فلاح کا ضامن ہے۔ وہاں افراد کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ بلکہ فرد کی اصلاح کو اصلاح کا نقطۂ آغاز قرار دیتا ہے۔ کیونکہ فرد معاشرے کی بنیادی اکائی ہے۔ لہٰذا فرد کی اصلاح دراصل معاشرے کی اصلاح ہے۔

ہمارے نزدیک اصلاح کے لئے درج ذیل اقدام نہایت موثر ثابت ہو سکتے ہیں۔

۱۔ سب سے پہلے افراد کے ذہنوں میں خدا کا صحیح تصور اور عقیدۂ آخرت کی اہمیت پر زور دیا جائے۔ نیز شرک سے اجتناب کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ تاکہ لوگ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے افعال میں خداوند کریم کے سامنے جواب دہی کے تصور کو مردہ نہ ہونے دیں اور صحیح نصب العین اور اعلیٰ وارفع اقدارِ حیات کے حصول کی خاطر کوشاں رہیں۔

۲۔ معاشرے کے اندر کسی ایسے ادارہ کی تشکیل کی جائے جو اصلاح وفساد کا تعین کرے اور ان تدابیر کو قابلِ عمل بنائے جن سے بگاڑ کی روک تھام ہو سکے۔ دینی نقطۂ نظر سے اس کو ادارہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ امت مسلمہ کی خصوصیت میں یہی بات بیان فرمائی گئی ہے۔

كنتم خير امت اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنكر (آل عمران:۱۱۵)

''تم وہ بہترین امت ہو جو لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتی اور برائی سے روکتی ہے۔''

امت کے ایک گروہ کیلئے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو فریضہ قرار دیا ہے۔

ولتكن منكم امة يدعون الى الخير ويامرون بالمعروف وينهون عن المنكر واولئك هم المفلحون۔(آل عمران:۱۰۴)

''تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہئے جو بھلائی کی طرف بلائے، اچھے کاموں کا حکم دے اور برائی سے روکے یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

اس طرح اگر امت مسلمہ اپنے فریضہ کو پہچانے، اس کا صالح عنصر مجتمع ہو جائے اور اس کا اپنا ذاتی اور اجتماعی رویہ خالص راستبازی، انصاف، حق پسندی، خلوص اور دیانت پر مضبوطی سے قائم ہو جائے تو منظم نیکی کے سامنے منظم بدی اپنے لشکروں کی کثرت کے باوجود شکست کھا جائے گی اور اگر خیر کے علمبردار سرے سے میدان میں ہی نہ آئیں تو میدان لامحالہ علمبردارانِ شر کے ہاتھ میں رہے گا۔

۳۔ حکومت کو ان صالح لوگوں کے ہاتھ میں ہونا چاہئے جو خیر کو قائم کریں اور شر کو روک سکیں۔ ''اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ'' ایک پرانا مقولہ ہے اور غالباً حدیث نبوی سے ہی اخذ کیا گیا ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

اَلْاِسْلَامُ وَالسُّلْطَانُ اَخَوَانِ تَوْأَمَانِ لَا یَصْلُحُ وَاحِدٌ مِّنْھُمَا اِلَّا بِصَاحِبِه فَالْاِسْلَامُ اُسٌّ وَالسُّلْطَانُ حَارِسٌ وَّمَا لَا اُسَّ لَهُ ھَادِمٌ وَّمَا لَا حَارِسَ له ضَائِعٌ (کنز العمال)

اسلام اور حکومت وریاست، دو جڑواں بھائی ہیں۔ دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ پس اسلام کی مثال ایک عمارت کی ہے اور حکومت گویا اس کی نگہبان ہے جس عمارت کی بنیاد نہ ہو، گر جاتی ہے اور جس کا نگہبان نہ ہو وہ لوٹ لیا جاتا ہے۔

ایک اور حدیث ہے:

اِنَّ اللہ لَیَزَعُ بِالسُّلْطَانِ مَا لَا یَزَعُ بِالْقُرْآنِ (تفسیر ابن کثیرؒ ج۳ص۵۹)

''اللہ تعالیٰ حکومت کی طاقت سے ان چیزوں کا سدباب کر دیتا ہے جن کا سدباب قرآن سے نہیں ہو سکتا۔''

حدیث میں قوم کے بناؤ اور بگاڑ کی ذمہ داری اس کے علماء اور امراء پر رکھی گئی ہے۔ کیونکہ زمامِ کار انہی لوگوں کے ہاتھ ہوتی ہے۔ اگر فرمانروا خدا پرست اور صالح ہوں تو زندگی کا سارا نظام خیر و صلاح پر چلے گا۔ اور حکومتِ وقت "ادارہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کی سفارشات پر غور کرے گی۔

۴۔ معاشرے کا اجتماعی شعور بیدار کیا جائے کہ کوئی شخص بھی بگاڑ کی طرف مائل نہ ہو۔ اس کے شعور کی تعمیر و ترقی کے لئے "ادارہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر" مندرجہ ذیل طریق اختیار کر سکتا ہے۔

(الف) تعلیم و تبلیغ کے زریعے وہ تمام صورتیں اختیار کی جاسکتی ہیں۔ جو دورِ حاضر میں نشر و اشاعت کے کام میں لائی جاتی ہیں۔ مثلاً اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن مذاکرات وغیرہ کے ذریعہ سے دینی اقدار اور اسلامی طرزِ حیات کی تفہیم کو فروغ دینے کی کوشش کی جائے، حقیقت یہ ہے کہ دورِ حاضر میں یہ ذرائع عوامی رجحانات کو بدلنے اور نیا رخ دینے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ معاشرے کے اندر غلط رجحانات کی ترویج میں ان اداروں کا بڑا حصہ ہے۔

(ب) یہ ادارہ معیاری معاشرت کے لئے عمدہ نمونہ اور مثال پیش کرے جس کی نہج پر پورے معاشرے کو ڈھالا جاسکے۔ نبی کریم ﷺ نے جن اصولوں کو بیان کیا تھا، ان اصولوں پر مبنی ایک سوسائٹی مدینہ طیبہ میں تشکیل دی تھی اس معاشرہ کا ہر فرد ان اصولوں کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔ لہٰذا اصلاح معاشرہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ نمونے کے چند افراد پر مشتمل ایک ایسی وحدت قائم ہونی چاہئے جس کو سامنے رکھ کر پورے معاشرے کو استوار کیا جاسکے۔

۵۔ معاشرے میں مسجد کی دینی اور سماجی حیثیت کو اجاگر کیا جائے اور اصلاح معاشرہ کے لئے مسجد کو مرکزی حیثیت دی جائے کیونکہ نظمِ اجتماعی کے لئے ایک مرکز کا ہونا ضروری ہے۔ جب تک مسلم سوسائٹی مسجد سے اپنا تعلق مضبوط نہیں کرتی اور مسجدیں پورے معاشرے پر اثر انداز ہونے کی صلاحیتوں کی حامل نہیں بن جاتیں، اس وقت تک اصلاح کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

۶۔ تعلیمی ادارے معاشرے میں اہمیت کے حامل ہیں۔ معاشرے کے اجتماعی شعور اور انفرادی تشخص کے ارتقاء کا دارومدار تعلیمی اداروں پر ہے جہاں اساتذہ اہم کردار ادا کرسکتے ہیں اس لئے ایسے اساتذہ کا انتظام کیا جائے جو طالب علموں میں اسلامی اقدار کو راسخ کردیں۔ اس کے علاوہ تعلیمی اداروں میں نصابات کی بھی جانچ پڑتال کی جائے اور ایسی تمام چیزیں جو روحِ دین کے منافی ہوں، ان کو پڑھاتے وقت تنقیدی طریقہ اختیار کیا جائے تاکہ طالب علم ان کی حقیقت سے واقف ہو جائیں، نیز ان داروں میں بنیادی دینی تعلیمات کا انتظام کیا جائے تاکہ طلباء اسلام کی اصلیت اور اس کی روح سے مکمل واقفیت حاصل کرسکیں۔

۷۔ دولت اور وسائلِ دولت پر تصرف اس طرح ہو کہ معاشرے میں معاشی ناانصافی، اسراف، بتذیر، بخل و ظلم اور ارتکازِ دولت نہ ہونے پائے۔ حکومت ان تمام ذرائع پر پابندی عائد کردے جو عوامی بہبود کے لئے ضرر رساں ہیں۔ معاشی نظام میں سود، احتکار و اکتناز، رشوت اور لوٹ کھسوٹ کی تمام صورتیں قانوناً اور حکماً بند کردی جائیں تاکہ معاشرہ طبقاتی معاشرت کا شکار نہ ہو۔

۸۔ معاشرے کی اصلاح کی خاطر حدود و تعزیرات کا نظام بھی قائم کیا جائے۔ جن کے ذریعے معاشرہ کو ان افراد سے محفوظ کیا جائے جو تعلیمی ترغیبات اور اخلاقی ذرائع سے اصلاح قبول نہ کریں اور معاشرے کے قانون کی خلاف ورزی کریں۔ حدود و تعزیرات کے نفاذ سے سماجی جرائم کا انسداد ہو گا اور معاشرہ غیر صالح عناصر کی فتنہ انگیزیوں سے محفوظ رہے گا۔

۹۔ سب سے آخر میں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ملک کا پورا نظام اسلامی ہو جس میں افراد اور معاشرہ روحِ دین سے سرشار ہو اور غیر اسلامی نظریات سر نہ اُٹھا سکیں۔ نظام کی تشکیل اس طرح ہو کہ غیر اسلامی نظریات کی بجائے اسلامی تعلیمات کی گرفت مضبوط ہو۔

لیکن اس کے ساتھ اتنی ہی اہم بات یہ ہے کہ ہر فرد "اپنی اصلاح آپ" کے اصول کو اپنائے اور دوسروں کی اصلاح کرنے کے بجائے اپنی اصلاح کرے۔ اصلاح معاشرہ کا آغاز انسان کی اپنی ذات سے ہوا ہے۔ اس سے وہ پیچیدگی دور ہو جائے گی جو دوسروں کی اصلاح کرنے کی صورت میں پیش آتی ہے۔ "اپنی اصلاح آپ" کے اصول کا ایک فائدہ یہ بھی ہو گا کہ افراد کے سامنے معیار کا تصور واضح ہو گا اور ہر شخص اس معیار کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالتا چلا جائے گا۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

استدراک:

"محدث" شمارہ اگست میں چھٹے اسلامی مہینے کا نام "جمادی الاخریٰ" لکھا گیا ہے جبکہ صحیح "جمادی الآخرہ" (Jumadal Aakhira) ہے کیونکہ "آخرۃ" اسم فاعل ہے جو آخر کا مؤنث ہے نہ کہ آخر اسم تفضیل کا مؤنث "اُخریٰ" اسی طرح اکثر لوگ چوتھے مہینے کا نام ربیع الثانی لکھتے ہیں حالانکہ ربیع الاول اور ربیع الثانی دو موسم ہیں جبکہ مہینوں کا صحیح نام ربیع الاول، ربیع الآخر ہے۔ (ادارہ)

مہدی اور مسیح دو یا ایک؟

مرزائیوں اور بھائیوں کے مابین ایک مناظرہ

مولانا محمد عالم آسی امر تسری

مرزائیوں کے خیال میں مرزا صاحب مسیح اور مہدی دونوں تھے اور بہائی مذہب میں چونکہ الگ الگ ہوئے ہیں۔ اس لئے ان کا آپس میں ایک دفعہ جو مقابلہ ہوا ہے اس موقعہ پر وہی نقل کر دینا کافی ہے۔

مرزائی:

امام مہدی کے متعلق جو روایات آئی ہیں، سب موضوع ہیں اور یہی وجہ ہے کہ صحیح مسلم و بخاری میں ان کو روایت نہیں کیا گیا۔ اور نہ ہی موطا امام مالک میں ان کا نشان ملتا ہے اور حسبِ تحقیق مرزا صاحب معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ محدثین کے بعد گھڑ لیا گیا ہے۔ کیونکہ ابنِ خلدون نے ان تمام روایات کو مخدوش قرار دیا ہے اور ان میں ایسا شدید اختلاف موجود ہے کہ وہ ایک دوسرے کی خود تردید کر رہی ہیں، اس لئے جنھوں نے ان کو تسلیم کر لیا ہے ان کو باہمی مطابقت پیدا کرنے میں یوں کہنا پڑا ہے کہ:

1. مہدی شخصی نام نہیں ہے بلکہ ایک جماعت کا نام ہے جو مختلف اوقات میں ہو گزرے ہیں، اور ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی ابھی باقی بھی ہو۔
2. مہدی اولادِ علیؓ سے تعلق رکھتا ہے۔ فاطمی ہونا ضروری نہیں۔ (حجج الکرامتہ) (ابوداؤد)
3. اولادِ امام حسن رضی اللہ عنہ میں سے کوئی ایک مہدی بن کر ظاہر ہو گا۔
4. اولادِ امام حسین رضی اللہ عنہ میں سے کوئی ایک مہدی بن کر ظاہر ہوا۔ (ابن عساکر)
5. مہدی حسنین رضی اللہ عنہما کی اولاد میں سے ہو گا۔ (حجج)
6. حضرت حمزہؓ اور حضرت جعفرؓ بھی اہلِ بیت میں داخل ہیں کیونکہ مہدی انکی اولاد میں سے ہو گا۔
7. مہدی بنی امیہ میں ظاہر ہوا۔ کیونکہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا قول ہے کہ میری اولاد میں مہدی ہو گا جو دنیا کو اپنے عدل و انصاف سے پُر کر دے گا۔ (تاریخ الخلفاء)
8. مہدی علیہ السلام اولادِ عباسؓ سے ظاہر ہوں گے۔ (حجج)
9. مہدی علیہ السلام کا ظہور قریش کے کسی قبیلے میں سے ہو گا۔ (کنز)
10. اولادِ علیؓ اور اولادِ عباسؓ دونوں سے آپ کا علق ہو گا۔ (حجج)
11. اتنا ثابت ہوا ہے کہ امام مہدی علیہ السلام کا ظہور اُمتِ محمدیہ ﷺ میں ہو گا، خدا جس کو چاہے مہدی بنا دے۔

12. محققین کا اصلی مذہب یہ ہے کہ ایک شخص پیدا ہو گا جو مسیحؑ اور مہدی دونوں کہلائے گا کیونکہ اوّلاً ابنِ ماجہ اور حاکم نے بروایت انسؓ ذکر کیا ہے کہ:

لا يزال الامر الا شدة ولا الدنيا الا او بأمر اولا الناس الا شحا ولا تقوم الناس الا على شرار الناس ولا المهدى الا عيسىٰ ابن مريم وثانياً كما ارسلنا الى فرعون رسولا میں اشارہ کیا ہے کہ حضرت نبی کریم ﷺ مثیل تھے اور آیت لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ میں اشارہ ہے کہ آخر الخلفاء سلسلہ موسویہ میں حضرت مسیح علیہ السلام تھے۔ اسی طرح ضروری ہے کہ سلسلۂ محمدیہ مماثلہ بسلسلہ الموسویہ میں بھی آخری خلیفہ محمدی وہ ایسا مہدی ہو گا جو مسیح بھی کہلائے گا اور اسی بنا پر اس خلیفہ کو ابن مریم کہا گیا ہے۔ ثالثاً نشانات مسیح تقریباً ایک ہی نہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مہدی اور مسیح صرف ایک شخص کے ہی صفاتی نام ہیں، جیسے نزول امطار، کثرت زروع، ترکِ جہاد، وجود عدل، کسر صلیب، اہلاکا ملل، ظہور من المشرق، دخول فے بیت المقدس وبیت اللہ شریف۔ رابعاً بر ایت احمد یہ وارد ہوا ہے:

يوشك من عاش منكم ان يلقى عيسٰى ابن مريم اماما مهديا و حكما عدلا فيكسر الصليب ويقتلا لخنزير وتضع الحرب اوزارها ۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ مسیح ہی امام، حکم اور مہدی کہلائے گا۔

بہائی:

1. اختلاف پیدا ہونے سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ تمام وایات ہی موضوع ہیں، ورنہ جس قدر اختلافی مسائل ہیں، ان کی بنیاد روایات موضوعہ پر ماننی پڑے گی۔
2. مسئلہ مہدی کو بنظر تحقیر دیکھنا خبث باطن یا جہالتِ اسلامی ظاہر کرتا ہے، ورنہ اگر واقعی قابلِ نفرت ہوتا تو اصحاب الجرو العدیل یا ائمہ کبار اور امامانِ اسلام اس سے نفرت کا اظہار کرتے۔
3. تعدد مہدی کا قول غلط ہے۔ کیونکہ جب محدثین نے اُصولِ حدیث کی رُو سے احادیث صحیحہ الگ کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ امام مہدی شخص معین ہے تو پھر کون سے امور ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم اختلاف رفع کرنے کی خاطر ایک نیا مسئلہ پیدا کریں کہ مسیح اور مہدی ہزاروں آئیں گے۔'' معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کو اس مسئلہ میں تحقیق نصیب ہی نہیں ہوئی۔
4. یہ قول بھی غلط ہے کہ جس حدیث کو موطا نقل نہیں کرتا وہ حدیث ہی موضوع ہے۔ کیا اس کی بابت قرآن شریف میں وارد ہو چکا ہے کہ: لا رطب ولا يابس الا فى كتاب مبين- اگر یہ تسلیم کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ صحاح ستہ موضوعات پر مشتمل ہوں۔
5. یہ اصول بھی غلط ہے کہ جو احادیث صحیحین میں نہیں ہیں وہ مردود ہیں اور یہ اصول بھی غلط ہے کہ جو حدیثیں صحیحین میں درج

ہیں وہ تمام واجب القبول ہیں۔ کیونکہ بقول مرزا صاحب (ازالہ نمبر ۲۲۶) بہت سی روایات ایسی ہیں کہ جن کو امام ابو حنیفہؒ نے تسلیم نہیں کیا۔

6. یہ بھی غلط ہے کہ صحیحین میں امام مہدی کا ذِکر نہیں آیا۔ ان کی روایت ہے۔

كيف انتم اذا نزل ابن مريم وامامكم منكم وعند مسلم فيقال لعيسٰى عمل بنا فيعتزرو بعضكم اولى ببعض فيقتدى المسيح بالمهدى (فتح البارى) ازا ينزل عيسٰى على انيق (وهو جبل عند بيت المقدس) وبيده حربة فياتى بيت المقدس ويقتل الدجال والناس فى صلوة الصبح والامام يؤم بهم ۔ (فتوی فتح الباری ص ۱۳۵)

7. یہ اُصول بھی غلط ہے کہ جس کتاب کے متعلق فصیل مذکور ہو تو دوسری کتابیں محمل ہو جاتی ہیں۔ دیکھئے قرآن شریف میں تورات کے لئے دفعیہ تفصیل کل شیٔ مذکور ہے اور یا اخت هٰرون کا لفظ تورات میں مذکور نہیں ہے بلکہ کسی صحیفۂ قدیم میں اس کا ذِکر نہیں۔

8. یہ بھی اصول غلط ہے کہ جس کو ابنِ خلدون غیر محقق تصور کرے وہ واقع میں بھی ایسا ہو، کیونکہ وہ محض موٴرخ ہے۔ اس کا کوئی مقام نہیں ہے کہ اصحاب الحدیث کے مقابلہ اپنی تحقیق پیش کرے۔

9. امام شوکانیؒ نے پچاس روایات لکھی ہیں۔ ملا علی قاری، ابن حجر، ابن تیمیہ، ابن قیم وغیرہ سب نے اس بات کو تسلیم کیا ہے۔

10. اگر تعدد مہدی صحیح ہے تو چونکہ مہدی و مسیح ایک ہیں۔ اس لئے یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ مسیح بھی ایک جماعت ہو کر کچھ گزری ہیں اور کچھ گزریں گے۔

11. اگر اختلاف روایات باعث تعدد ہے تو مسیح کو بھی متعدد ماننا پڑے اکیونکہ نزولِ مسیح میں بھی اختلاف ہے۔ حيث اختلف اولاً فى مقام نزوله الشرقى دمشق عند المنارة البيضأ (ترمذى نواس بن سمعان) اوروحاً روح المعانى (۲/۲۱۳) او جبل افيق (قريب بيعت المقدس وعكاء كنز العمال، حجج) وثانياً فى مكثه ايمكث اربعين سنة (كنز العمال) اَو ۴۵ سنة (حجج) او سبع سنين او تسع عشرة سنة (كما هو عند مسلم)

12. کچھ نشانات پائے جانے سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ واقعی قادیانی مدعی امام مہدی تھا۔ اس لئے ضروری ہے کہ علامات مختصہ کا امتحان کیا جائے۔ مثلاً کونہ من فاطمۃ (۱)، اسمہ محمد (۲)، حیوتہ بعد الدعوۃ (۳)، ملکہ سبع سنین (۴)، انتظار المسیح (۵)، ابطال الجزیۃ (۶)، وضع الحرب (۷)، نزول جبریل (۸)، اقتدار بعیسٰی (۹)، نزول عیسٰی (۱۰)، اعلانِ ظہور (۱۱)، بمنے مزدلفہ (۱۲)، اخذ البعیۃ فی الحطیم (۱۳)۔ ان گیارہ نشانات میں جو پورا اُترے وہ مہدی ہو گا۔

13. یہ کہنا بھی غلط ہے کہ یہ اختلاف آج تک رفع نہیں ہوا۔ کیونکہ جج میں ہے کہ مہدی کا اہلِ بیت سے ہونا متواتر ہے۔ اور آلِ عباس کی روایات تمام ضعیف یا مردود ہیں۔ امام شوکانیؒ توضیح میں لکھتے ہیں کہ یا ننھیال کی طرف سے امام صاحب عباسی ہوں گے اور یا یہ روایات قابلِ استدلال نہیں ہیں۔ ایک محقق کا قول ہے کہ مہدی عباسی کی حدیث ہی اور ہے۔ کیونکہ اس کے یہ الفاظ ہیں۔

منا السفاح منا المنصور ومنا المهدی (بیهقی)

14. قول عمر کہ وہ بنی امیر سے ہے۔ امیر معاویہ اس کی تردید کرتے ہیں کہ هو من اولاد علیؓ۔ (حجج طبرانی) مرزا صاحب خود بھی مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان بعض جداتی من نبی فاطمة اور غسل مصفٰے میں تسلیم کیا گیا ہے کہ جب آپ بنی فاطمہ میں داخل ہوئے تو آپ سید بھی بن گئے۔

15. بنی فاطمہ تسلیم کرنے سے امام مہدی پر تمام عنوان صادق آتے ہیں۔

من الامته من اهلِ البیت من الحسن ابًا من الحسین امّا

16. لا مہدی الا عیسیٰ قابلِ استدلال نہیں کیونکہ اس کا راوی محمد بن خالد ہے ۔ وهو متفرو به ومجهول عند البخاری قال فے الحجج حدثیه مضطرب وضعیف لا یعارض الصحاح ۔

17. اگر صحیح ہو تو بقول شوکانی یوں تاویل ہو گی کہ لا مهدی کاملا الا عیسیٰ یا یُوں کہیں گے کہ ان میں اتحاد زمانی مراد ہے۔ کقوله ما امرنا الا واحد۔

18. کما سے استدلال کرنا اس وقت مفید ہوتا کہ عیسیٰ سے پہلے مہدی بھی مانا جائے ورنہ تشبیہ نام سے رہے گی۔ مگر عسل مصفےٰ (۱۲/۲۳۹) میں یوں لکھا ہے کہ سید احمد بریلوی ۱۲۰۱ء میں یحییٰ کی طرح مبشر مرزا پیدا ہوئے تھے۔ مگر مرزا صاحب نہیں مانتے اور کہت ہیں کہ سید احمد کے پیرو چونکہ گمراہ ہیں۔ اس لئے داستان سازی میں مشغول رہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مسیح آسمان سے اُترے گا۔ بھلا جھوٹا ایسا نہ کہے تو کیا کہے۔

19. اب ثابت ہوا کہ مہدی سید ہو گا اور ختمِ رسالت کی وجہ سے نبی نہ ہو گا۔ اور مسیح کو بطریق توصیف مہدی کہا گیا ہے ورنہ اس کو بطور اسم علم کے مہدی نہیں کہا گیا۔ جیسا کہ وارد ہوا ہے۔

علیکم بسة الخلفاء الرشدین اَلمهد بین (ابو داؤد) ولجریر اللهم اجعله مهدیا (کنز العمال) ولابی ذر من سره ان ینظر الی عیسیٰ ابن مریم فلینظر الی ابی ذر الغفاری (ابن عساکر عن انس) ولن تهلك امترانا اولها وعیسیٰ اٰخرها والمهدی اوسطها (حاکم، ابو نعیم، ابن عساکر) فبطل ما قال فی العسل المصطفٰے اذا ذکر المهدی منفردا فالمراد به رجل صال (۲/۱۴۵) فعلیه

ان یقول ایضا ان المسیح اذا ذکر منفردا فالمرادیه رجل سیاح لیرتفع الامر من البین ۔ هذا ۔

تم ہدایت یافتہ خلفاء کے طریق کار کو اپناؤ (ابو داؤد) جریر کے لئے۔ اے اللہ! اسے ہدایت یافتہ بنا۔ ابو ذر کے لئے جو عیسیٰ بن مریم کو دیکھنا پسند کرے وہ ابو ذر کو دیکھ لے (ابن عساکر عن انس) وہ امت کبھی ہلاک نہ ہو گی جس کی ابتداء میں مَیں ہوں آخر میں عیسیٰ اور درمیان میں مہدی ہے۔ (حاکم ابو نعیم ابن عساکر) اس طرح عسل مصفی میں جو ہے وہ باطل ہو گیا کہ جب اکیلا مہدی ذکر ہو تو اس سے نیک آدمی مراد ہو گا۔ کیونکہ اس طرح یہ بھی کہنا چاہئے کہ جب مسیح اکیلا مذکور ہو تو اس سے سیاح آدمی مراد ہو گا تا کہ مسئلہ اختلاف سے نکل جائے۔

تاریخِ رقص

جناب مولوی لطیف الدین صاحب لطیف

رقص کب سے جاری ہے اور کن کن اغراض کے لئے یہ وجود میں آیا ہے، مندرجہ ذیل مضمون سے اس پر کافی روشنی پڑتی ہے اس کا ایک محرک "روحانی جذبہ" بھی ہے۔ ہمارے ہاں صوفیاء میں "وجد" کی شکل میں ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ ایک اہلِ ھوا کا شیوہ ہے۔ اور انہی کے طرزِ عمل سے ماخوذ ہے۔ اس لئے امامانِ دین نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔ (ادارہ)

رقص ایک نہایت قدیم عادت ہے۔ امم قدیمہ میں سے کوئی ایسی قوم نہیں ملتی جو اس کی عادی نہ ہو تلاش و تفحّص کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ حرکات، رقص فطرتاً ان لوگوں میں پیدا ہو جاتی ہیں جو کسی شدید مسرت یا انبساط سے متاثر ہوتے ہیں۔ عمیق غور و فکر کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ انسانی تخلیق میں تکلم پر رقص مقدم ہے اس کا ثبوت سوائے قیاسات عقلی کے اور دیگر دلائل سے دنیا ممکن نہیں، لیکن تاریخ سے نہایت قدیم زمانے میں مختلف قوموں کے نزدیک رقص کے شیوع کا پتہ چلتا ہے۔ بعض قوموں کے نزدیک رقص ایک دینی فریضہ تھا جس کو وہ اپنے معبودوں کی رضا کے حصول کے لئے ادا کرتی تھیں۔

توریت میں ہے کہ یہود خدا کی تسبیح و تقدیس رقص ہی کے ذریعہ کرتے تھے۔ قدمائے یونان نے اس کو اپنے طرزِ عمل سے اور زیادہ تقویت پہنچائی، یہاں تک کہ اُنہوں نے زندگی کی ہر اک حالت کے لئے مختص مخصوص رقصوں کو لابدی قرار دے دیا تھا کہ حالتِ مذکورہ اپنی دیگر متقابل حالتوں سے ممتاز ہو جائے (مثلاً فرحت، حزن، غضب وغیرہ)

ارسطو نے اس کو فنونِ لطیفہ میں شمار کیا ہے۔ اس کے نزدیک شعر اور رقص دونوں مساوی درجہ رکھتے ہیں۔ اہلِ سپارٹا اپنے بچوں کو ۵ سال کی عمر سے ہی رقص سکھانے لگتے ہیں۔ عموماً لڑکوں کے باپ اور استاد گاتے تھے اور وہ خود ناچتے تھے، قدماء نے رقص کو تین مراتب میں تقسیم کیا تھا۔

رقصِ عسکری:

جس سے مقصود صرف ایک سخت ورزش کرنا تھی۔

رقصِ منزلی:

جس سے محض تفریحِ طبع کا کام لیا جاتا تھا۔

رقصِ دینی:

: جس کو اثنائے عبادات یا قربانیوں کے ذبح کے وقت ادا کیا جاتا تھا۔

قدیم تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیحین اپنے دینی اجتماعات کے مواقع پر اکثر رقص کیا کرتے تھے۔ ہندوستان میں یہ قدیم رسم تھی

کہ ان کی عمومی مجالس میں ناچنے والی لڑکیوں کی کئی ایک ٹولیاں رقص کے ذریعے زینتِ بزم کا سامان بہم پہنچاتی تھیں۔ اہلِ عرب بھی دیگر اقوام کی طرح عادتِ رقص سے مامون نہ رہ سکے وہ بھی ایامِ جاہلیت میں اپنی مجالس دینیہ میں دیگر اقوام کی طرح ناچتے تھے۔

آج ہمارے نزدیک رقص ایک کھیل کود سے زیادہ وقعت نہیں رکھا۔ لیکن یورپین اس سے ریاضتِ جسدی کا کام لیتے ہیں۔ انہوں نے نفسیات کے جملہ فنون کی طرح اسے بھی ایک نفسی فن قرار دیا ہے اور اس کے تمام اصول و ضوابط مدوّن کر چکے ہیں۔ اور ان میں سے کوئی بھی پرہیز نہیں کرتا۔ برخلاف ہمارے کہ ہم اس کو نہایت شرمناک عادت قرار دیتے ہیں اور ہمارے مؤدبین محافل رقص میں ہماری شرکت تک کو مکروہ سمجھتے ہیں، لیکن وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جن کی تربیت ہی یورپین اخلاق کے مطابق ہوئی ہے یا جو ان کے ہمیشہ ہم صحبت و ہم نوالہ بنے رہتے ہیں اور اس میں کوئی جھگڑا ہی نہیں کیونکہ ہر شخص اپنی زندگی میں اپنی مخصوص عادات و خصائل کا خوگر ہوتا ہے۔ ہاں مشرق و مغرب میں اعتبارِ رقص کا فرق بھی ان کے تمام فرقوں کی طرح جو حجاب، پوزیشن اور دیگر عادات میں پائے جاتے ہیں نمایاں طور پر جلوہ گر ہے۔ لیکن اہلِ مشرق حالتِ رقص میں اپنی عورات کی پردہ پوشی میں اہلِ مغرب سے زیادہ باغیرت ہو رہے ہیں۔

عبرانیین نے اگرچہ رقص کے معاملہ میں حد سے زیادہ مبالغ کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس کو حصولِ رضائے الٰہی کا ایک ذریعہ قرار دے دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے مرد، عورتوں کے ساتھ مل کر رقص نہیں کرتے۔ ہاں کبھی اقتضائے حال سے مجبور ہو کر ان کی دونوں صنفیں ایک ساتھ مل کر رقص کرتی ہیں لیکن احتیاط اس قدر ملحوظ ہوتی ہے کہ دونوں جنسیں علیحدہ علیحدہ ناچتی ہیں۔ اس طرح شرق و غرب کے دیگر فرقوں کو بھی معلوم کر لیا کرو۔ فقط

مفید الاحناف

ایک صورتِ ایتلاف

مولانا حکیم محمد عبد الغفور رمضان پوری بہاریؒ
ترجمہ با محاورہ از پروفیسر حافظ ثناء اللہ خان ایم۔اے

قسط نمبر ۴ (آخری)

سوال:

رفع یدین سے نماز فاسد ہوتی ہے یا نہیں؟

جواب:

نہیں۔ردّالمحتار ص ۶۸۴ میں ہے:

وما روی من الفساد شاذ اھ

رفع یدین سے نماز خراب ہو جانے کی روایت شاذ ہے۔

عمدۃ الرعایہ میں ہے:

ویتفرع علی ھذا القول ما ذکر فی بعض الکتب ان الصلوۃ تفسد برفع الیدین عند الرکوع وعند السجود وھو قول شاذ مردود کما فی فتح القدیر والحلیۃ والبرازیۃ وغیرھا اھ ۔''

بعض کتابوں میں اسی قول کی بنا پر ذکر کیا گیا ہے کہ رکوع و سجود کے وقت رفع یدین سے نماز فاسد ہو جاتی ہے حالانکہ یہ قول شاذ اور مردود ہے جیسا کہ فتح القدیر، حلیہ اور بزازیہ وغیرہ میں ہے۔

اور بھی عمدۃ الرعایہ میں ہے:

منھم من صرح بان رفع الیدین فی اثناء الصلوۃ مفسد وقد عرفت انہ قول شاذ مردود فلوجد والتحریمۃ مع رفع الیدین ایضا فالحکم ھو ما ذکرہ فان رفع الیدین غیر مفسد علی القول الصحیح الذی لیس ما سواہ الا غلطا اھ ۔

حنفی فقہاء میں سے ایک شخص ہے جس نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ رفع یدین درمیان نماز کے مفسد ہے۔ تم نے اس قول کو دیکھ ہی لیا ہے کہ یہ شاذ اور مردود ہے کیونکہ اگر تکبیر تحریمہ کے ساتھ از سر نو رفع یدین کر کے نیت باندھنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی تو۔ دورانِ نماز کیونکر ہو گئی۔ پس یہی قول صحیح ہے اس کے سوا باقی غلط ہیں۔

تراجم حنفیہ میں لکھا ہے:

والحق ان هذه الروایة الّتی رواها مکحول شاذ لا یعتد بها ولا بذاکرها ومن صرح بشذوزها محمد بن عبد الواحد الشهیر بأبن الهمام فی فتح القدیر وذکر انه صرح بشذوذها صاحب النهایة وفی حلیة المحلی شرح منیة المصلی لابن امیر حاج الفساد برفع الیدین فی الصلوة روایة مکحول النسفے عن ابی حنیفة وهو خلاف اهر الروایة ففی الذخیرة رفع الیدین لا یفسد منصوص علیه فی باب صلوة العیدین من الجامع ومشی علیه فی الخلاصة وهو اولی بالاعتبار اٰه وفی البزازیة رفع الیدین فی المختار لا یفسد لان مفسدها لم یعرف قربة فیها اٰة وفی السراجیة رفع الیدین لا یفسد وهو المختار اٰه۔

اور حقیقت تو یہ ہے کہ مکحول نے جس روایت کا ذکر کیا ہے وہ شاذ ہے۔ اس روایت کا اور اس کے راوی کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور جن لوگوں نے اس کے شاذ ہونے کی تصریح کی ہے ان میں سے محمد بن عبد الواحد المشہور بابن الہام ہیں جنہوں نے فتح القدیر میں اس کا ذِکر کیا ہے اور ابن ہمام نے مکحول سے روایت کیا ہے کہ صاحبنہایۃ اور ابن امیر حاج کی حلیۃ المحلی شرح منیۃ المصلی میں اس کے شاذ ہونے کا بالتصریح ذکر موجود ہے کہ رفع یدین کے ساتھ نماز کا فاسد ہونا ابو حنیفہ سے مکحول نسفی نے روایت کیا ہے مگر یہ ظاہر روایت کے خلاف ہے پس ذخیرہ میں ہے کہ رفع یدین نماز کو فاسد نہیں کرتا۔

اسی سے دلیل لی گئی ہے باب صلوٰۃ العیدین میں اور اسی پر انحصار کیا ہے خلاصہ میں اور یہی قابلِ اعتبار ہے اور بزازیہ میں ہے کہ مذہب مختار میں رفع الیدین نماز کو فاسد نہیں کرتا اور سراجیہ میں ہے کہ رفع یدین مفسد نہیں ہے اور یہی مذہب مختار ہے۔

اور سعایہ میں تحریر فرمایا ہے:

واغرب بعض اصحابنا حیث ذهب الی انه لو رفع یدیه عند الرکوع فسدت صلاته وقد رده بأحسن رد العلامة القونوی فی رسالته الّتی صنفها فی خصص هذه المسالة

اور ہمارے بعض اصحاب نے غریب بات کہی ہے جب وہ کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص رکوع کے وقت رفع یدین کرے تو اس کی نماز فساد ہو جاتی ہے۔ علامہ قونوی نے اپنے اس رسالہ میں اس کا خوب رو کیا ہے جو انہوں نے صرف اسی مسئلہ کے بارے میں تصنیف کیا ہے۔

سوال:

جو مصلی کہ ایک صف سے دوسری صف میں کھینچ لایا گیا آیا نماز اس کی فاسد ہوتی ہے یا نہیں؟

جواب:

نہیں۔ درّ مختار میں ہے:

ثم نقل تصحیح عدم الفساد فی مسئلة من جذب من الصف فتاخر اٰه

پھر اس شخص کی نماز کے فاسد نہ ہونے کا ذِکر کیا گیا ہے جسے صف سے کھینچا گیا اور وہ پیچھے ہٹ آیا۔

اور رد المختار کے صفحہ ۵۹۶ میں ہے:

وعبارۃ المصنف فی المنح بعد ان ذکر لوجذبه اٰکر فتاخر الاصح لا تفسد صلاته اھ ۔

اور عبارت مصنف کی منح میں موجود ہے جو انہوں نے اس بات کا ذِکر کرنے کے بعد درج کی ہے کہ اگر ایک نمازی دوسرے نمازی کو کھینچتا ہے تو اس کی نماز فاسد نہیں ہوتی۔

سوال:

گھوڑے کی باگ دوڑ پکڑے ہوئے نماز پڑھنے سے یا اندر نماز کے اس گھوڑے کے چھوٹ جانے پر اس کو پکڑنے کے لئے چند قدم چلنے سے نماز فاسد ہوتی ہے یا نہیں۔

جواب:

نہیں۔ در مختار کے صفحہ ۶۵۵ میں ہے:

مشی مستقبل القبله هل تفسد ان مشی قدر صف ثم وقف قدر رکن ثم مشی ووقف کذلك وهکذا الا تفسد وان کثر مالم یختلف المکان وقیل لا تفسد حالة العذر اھ ۔

نمازی کے قبلہ رُخ چلنے سے نماز فاسد ہو گی یا نہیں۔ پس اگر وہ ایک صف کے برابر چلے اور پھر ایک رکن کی مقدار ٹھہر جائے پھر چلے اور پھر رک جائے اور اس طرح وہ جب تک جگہ نہ بدلے خواہ کتنا ہی چلتا جائے نماز فاسد نہیں ہو گی اور بعض کا خیال ہے کہ عذر کی حالت میں نماز فاسد نہیں ہوتی۔

ردّ المختار میں ہے:

ای وان کثر واختلف المکان لما فی الحلیة عن الذخیرۃ انه روی ان ابا برزۃ رضی الله عنه صلی رکعتین اٰکذ ابقیاد فرسه ثم انسل عن یده فضی الفرس علی القبلة فتبعه حتیٰ اخذ بقیاده ثم رجع ناکصا علی عقبیه حتیٰ صلی الرکعتین الباقیتین قال محمد فی السیر الکبیر وبهذا ناخذ الخ ۔

اگرچہ ایسا کئی مرتبہ ہوا اور جگہ بھی بدل گئی ہو اس روایت کے مطابق جو حلیہ میں ذخیرہ سے منقول ہے کہ حضرت ابو برزہؓ نے اپنے گھوڑے کی باگ تھام کر دو رکعت نماز پڑھی تو وہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور گھوڑے نے قبلہ کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ پس ابو برزہؓ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلے حتیٰ کہ اس کی باگ پکڑ لی پھر پچھلے پاؤں واپس لوٹے اور باقی ماندہ دونوں رکعتیں ادا کیں۔ امام محمدؒ نے سیر کبیر میں کہا ہے کہ ہم بھی اسی کو اختیار کرتے ہیں۔

سوال:

نمازِ پنجگانہ میں جماعت واجب ہے یا نہیں؟

جواب:

واجب ہے۔ مراقی الفلاح میں ہے:

الصلوۃ بالجماعۃ سنۃ موکدۃ شبیھۃ بالواجب فی القوۃ اھ۔

نماز باجماعت ادا کرنا سنت موکدہ ہے جو کہ قوت میں واجب کے مشابہ ہے۔

جواہر نفیہ میں ہے:

الجماعۃ سنۃ مؤکدۃ ای قویۃ تشبہ الواجب فی القوۃ حتی استدل بملازمتھا علی الایمان اھ۔

نماز باجماعت پڑھنا سنت موکدہ ہے یعنی قوت میں واجب کے مشابہ ہے۔ یہاں تک کہ اس کے ایمان کے ساتھ لازم وملزوم ہونے کی دلیل بھی اسی سے لی گئی ہے۔

فصیح الدین کی شرح وقایہ میں ہے:

الجماعۃ سنۃ موکدۃ ای قویۃ تشبہ الواجب لا یرخص ترکھا الا من عذر اھ۔

جماعت سنت موکدہ ہے یعنی قوی ہے اور واجب کے مشابہ ہے۔ بغیر کسی (شرعی) عذر کے اس کو چھوڑنے کی رخصت نہیں دی جاتی۔

مجتبٰی شرح قدوری میں ہے:

واما اصحابنا فقد اختلفت الروایات عنھم فقیل انھا واجبۃ وقیل سنۃ مؤکدۃ غایۃ التاکید قلت والظاھر انھم ارادوا بالتاکید الوجوب اھ۔

جہاں تک ہمارا اصحاب کا تعلق ہے ان کی روایات مختلف ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ جماعت واجب ہے اور بعض نے نہایت تاکید کے ساتھ سنت موکدہ کہا ہے، میں کہتا ہوں کہ یہ بات واضح ہے کہ انہوں نے بھی تاکید سے واجب ہی مراد لی ہے۔

مجمع الانہر میں ہے:

الجماعۃ سنۃ مؤکۃ ای قریبۃ من الواجب حتّی لو ترکھا اھل مصر لقوتلوا واذا ترك واحد ضرب وحبس ولا یرخص لاحد ترکھا الا لعذر منہ المطر والطین والبرد الشدید اھ۔

نماز باجماعت سنت موکدہ ہے یعنی واجب کے قریب ہے پس اگر شہر والے اسے ترک کر دیں تو ان سے جنگ کی جانی چاہئے اور اگر کوئی فرد واحد چھوڑ دے تو اسے پیٹا جائے اور قید کیا جائے اور کسی کو عذر کے بغیر جماعت ترک کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ مثلاً بارش، کیچڑ یا سخت سردی وغیرہ کی

وجہ سے۔

بحر الرائق میں ہے:

الجماعة سنة موكدة اى قوية تشبه الواجب والراجح عند اهل المذهب الوجوب ونقله فى البدائع عن عامة مشائخنا وذكر هو وغيره ان القائل منهم انه سنة موكدة ليس مخالفها فى الحقيقة بل فى العبارة لان السنة الموكدة والواجب سواء خصوصا ما كان من شعائر الاسلام وفى المجتبى الظاهر انهم ارادوا بالتاكيد الوجوب لاستدلالهم بالاخبار الواردة بالوعيد الشديد بترك الجماعة وفى القنية وغيرها يجب التعزير على تاركها بغير عذر و ياثم الجيران بالسكوت اھ۔

جماعت سنت مؤکدہ ہے یعنی قوی ہے اور واجب کے مشابہ اور اہل مذہب کے نزدیک اس کا وجوب ہی راجح ہے اور ہمارے عام مشائخ سے اس کو بدائع میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس نے اور دوسروں نے ذکر کیا ہے کہ قائل حقیقت میں سنت مؤکدہ کا مخالف نہیں ہے بلکہ عبارت میں اختلاف ہے کیونکہ واجب اور سنت مؤکدہ برابر ہی ہیں۔ خاص کر شعائرِ اسلام میں۔ مجتبیٰ میں ہے کہ فقہاء نے نزدیک سے وجوب ہی کا ارادہ کیا ہے۔ کیونکہ ان کے پیش نظر ان لوگوں کے لئے دلیل لانا مقصود ہے جو باوجود سخت وعید کے تارکِ جماعت ہیں اور قنیہ وغیرہ میں ہے کہ بلا عذر تارکِ جماعت کو سزا دینی چاہئے اور اگر ہمسائے چپ رہیں تو وہ بھی گنہگار ہوتے ہیں۔

اور منح الغفار میں ہے:

الجماعة سنة موكدة اى قربة تشبه الواجب فى القوة وقيل واجبة وعليه العامة اھ۔

جماعت سنت مؤکدہ ہے یعنی قوت میں مشابہ ہے واجب کے اور اکثر فقہاء کا یہی عقیدہ ہے اور زیلعی شرح کنز میں ہے:

وفى العناية قال عامة مشائخنا انها واجبة وفى المفيد انها واجبة وتسميتها سنة لوجوبها بالسنة اھ هذا كله فى السعى المشكور لمولانا محمد عبد الحى المخضور ۱۸۲

اور عنایۃ میں ہے کہ ہمارے عام مشائخ نے جماعت کو واجب کہا ہے اور مفید میں ہے کہ جماعت واجب ہے۔ جماعت کا نام سنت رکھنے کی وجہ سنت میں اس کے واجب ہونے کا ثبوت ہے۔

اور عمدۃ الرعایہ میں ہے:

الجماعة سنة موكدة هى التى تسمى بسنة الهدى وحكمها انه يثاب فاعلها ويلام تاركها بلا عذر مرخص وهذا احد لا قوال فيه والقول الثانى ان الجماعة مستحبة لكنه قول شاذ مردود لو ردد كثير من الاحاديث بالوعيد على التارك ومن المعلوم ان تارك المستحبة غير ملام اھ والقول الثالث وهو انها واجبة وهو الذى رجحه صاحب البحر والغنية والبدائع والمجتبى ونسبه السروجى وغيره الى عامة مشائخنا اھ ملخصا

جماعت سنت موکدہ ہے اور یہ وہی ہے جس کو سنت ہدی کہتے ہیں۔یعنی جس کے کرنے والے کو ثواب ملتا ہے اور بلا شرعی عذر ترک کرنے والے کو ملامت کی جاتی ہے۔اسی سلسلہ میں دوسرا قول یہ ہے کہ جماعت مستحب ہے مگر چونکہ تارکِ جماعت کے بارے میں بہت سی وعید کی احادیث آئی ہیں۔اس لئے یہ شاذ اور مردود ہے اور یہ بات واضح ہے کہ مستحب کا تارک ملامت نہیں کیا جاتا اور تیسرا قول یہ ہے کہ جماعت واجب ہے اسی کو صاحب بحر الرائق،غنیہ اور بدائع نے ترجیح دی ہے اور سروجی وغیرہ نے اس قول کو ہمارے اکثر مشائخ سے منسوب کیا ہے۔

سوال:

جماعت عورتوں کی مسنون ہے یا مکروہ ومنسوخ؟

جواب:

مکروہ یا منسوخ نہیں۔چنانچہ فتح الودود حاشیہ سنن ابی داؤد میں تحت حدیث ام ورقہ کے لکھا ہے:

ان هذا الحديث يدل على جواز امامة المرءة للنساء ومن يقول بكراهة جماعتهن يعمل الحديث على النسخ لكن ابن الهمام وغيره ينكرون تحقق الناسخ اه۔

یہ حدیث عورتوں کے لئے عورت کی امامت پر دلالت کرتی ہے اور جو شخص عورتوں کی جماعت کو مکروہ جانتا ہے وہ اس حدیث کو منسوخ سمجھتا ہے مگر ابن ہمام وغیرہ نے کہا ہے کہ اس کا ناسخ ثابت ہی نہیں ہوتا۔

مولانا عبد العلی رحمہ اللہ نے ارکان اربعہ میں لکھا ہے:

وعلى هذا فدعوى الكراهة مشكلة لا بدلها من دليل وسيل الشيخ ابن الهمام الى عدم الكراهة اه

لہٰذا کراہت کا دعویٰ بغیر کسی دلیل کے مشکل ہے اور شیخ ابن الہمام تو اس کے عدم کراہت کے ہی قائل ہیں۔

اور ابن ہمام کی فتح القدیر میں ہے:

ولا علينا ان نذهب الى ذلك فان المقصود اتباع الحق حيث كان اه

ہمارے لئے ضروری نہیں ہے کہ ہم اس کے نسخ کی طرف جائیں۔مقصد تو حق کی اتباع ہے خواہ وہ کہیں ہو۔

عمدۃ الرعایہ میں ہے:

ولا يخفى ضعفه بل ضعف جميع ما وجهوا الكراهة كما حققناه فى تحفة النبلاء الفناها فى مسئلة جماعة النسآء وذكر هناك ان الحق عدم الكراهة كيف لا وقد امّت بهن ام سلمة وعائشة فى التراويح و فى الفرض كما اخرج ابن ابى شيبة وغيره وامت ام ورقة فى عهد النبى ﷺ بامره كما اخرجه ابو داؤد اه

یہ مسئلہ خود ہی نہیں بلکہ اس کے متعلق حکم کراہت کے جتنے دلائل بھی فقہاء نے ذکر کئے ہیں۔یہ سب واضح طور پر ضعیف اور کمزور ہیں جیسے کہ

تحفۃ النبلاء میں جسے ہم نے عورتوں کی جماعت کے بارے میں تصنیف کیا ہے اس میں ہم نے تحقیق کی ہے اور اس رسالہ میں ہم نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ سچ بات تو یہ ہے کہ اس میں کوئی کراہت نہیں ایسا کیوں نہ کہا جائے جب کہ بموجب روایت ابن ابی شیبہ وغیرہ حضرات ام سلمہؓ وعائشہؓ نے راوتح اور فرض میں امامت کی ہے اور عہد نبوی میں خود حضور ﷺ کے حکم سے ام ورقہ رضی اللہ عنہانے امامت کرائی ہے۔(بموجب روایت ابی داؤد)

سوال:

قضاء نماز جہریہ میں جہر افضل ہے یا نہ؟

جواب:

ہے۔ نفع المفتی والسائل میں لکھاہے:

الذی یقضی الصلوۃ الجهریة منفردا فانه مخیر بین ان یجهر وبین ان یسر والجهر افضل وهو مختار السرخسی وخر الاسلام وجماعة من المتاخرین وقال قاضی هو الصحیح وفی الذخیرة هو الاصح اھ وقال البر جندی ذکر فی الظهیریة و الذخیرة والخزانة والکافی ان الجهر فی قضاء الجهریة افضل اھ

جو شخص اکیلا ہو اور کسی جہری نماز (مغرب، عشاءم، صبح) کی قضائی دے رہا ہو اسے قضا ہر دو طرح پڑھنا جائز ہے خواہ بآواز بلند پڑھے یا بآواز پست قرآت کرے۔ البتہ بآواز بلند پڑھنا اس کے لئے افضل ہے۔ سرخسی، فخر الاسلام اور متاخرین کی ایک جماعت نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ قاضی خاں نے کہا کہ بآواز بلند پڑھنا ہی صحیح ہے۔ ذخیرہ میں لکھا ہے کہ یہ مسلک زیادہ صحیح ہے۔ ظہیریہ، ذخیرہ، خزانہ اور کافی میں جہری نماز کی قضاء میں بقول برجندی بلند آواز سے پڑھنا افضل ہے۔

سوال:

اقتدا ساتھ مخالف فی الفروع کے جائز ہے یا مکروہ؟

جواب:

جائز ہے۔ ردالمختار ص۵۸۸ میں ہے:

واما القتداء بالمخالف فی الفروع کالشافعی فیجوز ما لم یعلم منه ما یفسد الصلوۃ علی اعتقاد المقتدی علیه الاجماع انما اختلف فی الکراهة اھ فقید بالمفسدون غیر کما تری وفی رسالة الاهتداء فی الاقتداء لملا علی القاری ذهب عامة مشائخنا الی الجواز اذا کان یحتاط فی موضع الخلاف والا فلا والمعنی انه یجوز فی المراعی بلا کراهة وفی غیره معها ثم المواضع المهمة للمراعاة ان یتوضا من الفصد والحجامة والقئ والرعاف ونحو ذلك لا فیما

هو سنة عنده مكروه عندنا كرفع اليدين فى الانتقالات وجهر البسمله واخفائها فهذا وامثاله لا يمكن فيه الخروج عن عهدة الخلاف فكلهم يتبع مذهبه ولا يمنع مشربه اھ ۔

مقتدی کو جب تک ایسے مسائل سے دوچار نہ ہونا پڑے جن کی بناء پر اِس کے نزدیک نماز فاسد ہو جائے ایسے مقتدی کو کسی شافعی وغیرہ، جس سے اس کے اختلافات فروعی ہوں، کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے۔ اس پر اجماع ہے البتہ کراہت مختلف فیہ ہے الخ جیسے کہ عبارت سے واضح ہے۔ مصنف در المتار نے نماز فاسد کرنے والے مسائل کی قید لگائی ہے کوئی اور قید نہیں لگائی۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ الاھتداء فی الاقتداء میں لکھا ہے کہ جب امام اختلافی مقامات میں احتیاط کرتا ہو تو اس کی اقتداء ہمارے اکثر علماء کے نزدیک جائز ہے ورنہ نہیں۔ احتیاط سے مقصود یہ ہے کہ وہ قابلِ رعایت اختلافی موقعوں پر مقتدیوں کا لحاظ کرتے ہوئے اختلاف سے نکل جائے تو اس کے پیچھے نماز بلا کراہت جائزہ گی ورنہ جائز تو ہو گی لیکن مکروہ پھر قابل رعایت مقامات سے مراد فصد کرانے اور پچھنے لگوانے کے بعد وضو، قے کرنے اور نکسیر وغیرہ کے بعد وضوء ہیں (جنہیں امام ضروری نہ سمجھنے کے باوجود مقتدیوں کی رعایت سے وضو کر سکتا ہے) لیکن وہ مقامات (جن میں وہ مقتدیوں کی رعایت نہیں کر سکتا) مراد نہیں کہ اس کے نزدیک سنت ہیں اور مقتدیوں کے نزدیک مکروہ۔ مثلاً نماز میں رکوع سے قبل اور رکوع کے بعد رفع الیدین کی تبدیلی، بسم اللہ کا باآواز بلند پڑھنا یا آہستہ پڑھنا یہ اور ان جیسے دوسرے مواقع پر وہ مقتدیوں کی رعایت کرتا ہوا اختلاف سے نہیں نکل سکتا۔ کیونکہ ہر ایک اپنے مذہب کی پیروی کرتا ہے اور اپنے مشرب سے نہیں روکا جا سکتا (یعنی اس صورت میں اس کی اقتداء مع الکراہت جائز ہو گی۔) الخ

سوال:

کلمہ لا باس بہ مستعمل منوب میں ہے یا نہ؟

جواب:

ہے۔ ردالمختار ص ۱۲۴ میں ہے:

فكلمة لا بأس وان كان الغالب استعمالها فيما تركه اولى لكنها قد تستعمل فى المندوب كما صرح به فى البحر اھ ۔

کلمہ لا باس (کوئی حرج نہیں) اگرچہ اکثر اوقات اس کا استعمال ایسے معنی میں لیا جاتا ہے کہ یہ کام نہ کرنا افضل ہے لیکن بعض اوقات ایسے کام کے متعلق بھی مستعمل ہوتا ہے جس کا کرنا بہتر ہو جیسا کہ بحر الرائق میں تصریح موجود ہے۔

سوال:

رفع یدین چاروں تکبیرات نماز جنازہ میں ثابت ہے یا نہ؟

جواب:

ہے۔ چنانچہ در مختار میں ہے:

یرفع یدیه فی الاولی فقط وقال ائمة بلخ فی کلها اھ۔

صرف پہلی تکبیر میں ہاتھ اُٹھائے البتہ ائمہ بلخ کے نزدیک تمام تکبیروں میں ہاتھ اُٹھائے گا۔

ردالمختار میں ہے:

وما فی شرح الکیدانیه للقهستانی من انه لا یجوز المتابعة فی رفع الیدین فی تکبیرات الرکوع وتکبیرات الجنازة فیه نظر اذ لیس ذٰلك مما لا یسوغ الاجتهاد فیه بالنظر الی الرفع فی تکبیرات الجنازة لما علمت من انه قال به البلخیون من ائمتنا اھ۔

قہستانی کی شرح کیدانی کی عبارت ''امام کی اتباع میں رکوع اور جنازے کی تکبیروں میں رفع یدین کرنا جائز نہیں، محل نظر ہے کیوں کہ یہ ان مسائل سے نہیں جن میں اجتہاد جائز نہ ہو بلحاظ تکبیرات جنازہ کے موقعہ پر رفع یدین کرنے کے کیونکہ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ائمۂ بلخ نے (رفع الیدین کا) فتویٰ دیا ہے۔

حسن شرنبلالی نے ص ۲۰۳ حاشیۂ درر میں لکھا ہے:

قوله یرفع یدیه فی الاولی فقط هو ظاهر الروایة قوله وعند الشافعی فی کلها اختاره کثیر من مشائخ بلخ کما فی التبیین اھ۔

صرف پہلی بار ہاتھ اُٹھائے، ظاہر روایت یہی ہے۔ لیکن امام شافعی کے نزدیک تمام تکبیروں میں ہاتھ اُٹھانے چاہییں اور بقول صاحبِ تبیین ائمہ بلخ میں سے اکثر علماء نے اسی کو ترجیح دی ہے۔

عمدۃ الرعایہ میں ہے:

قوله خلافا للشافعی و کذا الاحمد ومالك بل قال به ائمة بلخ من مشائخنا وهو روایة عن ابی حنیفة ایضا اھ۔

امام شافعی، احمد اور مالک اس کے خلاف ہیں۔ بلکہ ہمارا ائمہ بلخ کا بھی یہی نظریہ ہے اور اس بارے میں امام ابو حنیفہ سے بھی ایک روایت آتی ہے۔

سوال:

نمازِ جنازہ میں بعد تکبیر اولیٰ کے سورہ فاتحہ پڑھنی چاہیے یا نہیں؟

جواب:

چاہیے۔ حسن شربلالی نے ص ۲۰۳ حاشیہ درر میں لکھا ہے:

قوله لا قراءة فيها الخ ـ وقال فى الولوالجية ان قراء الفاتحة بنية الدعاء لا بأس به وان قراها بنية القراءة لا يجوز اه اقوال نفى الجواز فيه تامل لا نار أينا فى كثير من مواضع الخلاف استحباب رعايته كاعادة الوضوء من سس الذكر والمرءة فيكون رعاية صحة الصلوة بقراءة الفاتحة على قصد القراٰن كذلك بل اولى لان الامام الشافعي يفرضها فى الجنازة فتامل ـ

صاحب ولوالجیہ کے نزدیک دعاء کی غرض سے تو سورۃ فاتحہ جائز ہے لیکن قرأت کی غرض سے پڑھنا ناجائز ہے۔ میں کہتا ہوں ناجائز کہنا غور طلب ہے کیونکہ ہم نے اختلافی مسائل کے بارے میں اکثر یہی دیکھا ہے کہ اختلاف سے بچ نکلنا مستحب ہے۔ مثلاً شرم گاہ کو ہاتھ لگانے اور عورت کو چھونے سے وضو کرنا۔ نماز کی صحت کو ملحوظ رکھتے ہوئے سورہ فاتحہ قرأت کی غرض سے پڑھنا بھی ایسا ہی ہوگا۔ بلکہ یہ بہتر ہے کیونکہ امام شافعی نماز جنازہ میں اسے فرض قرار دیتے ہیں۔

عمدۃ الرعایہ میں ہے:

خلافا للشافعیؒ فان عنده يقرأ الفاتحة بعد التكبيرة الاولى وهو الا قوى دليلا وهو الذى اختاره الشر نبلالى من اصحابنا والف فيه رسالة اه ـ

امام شافعی اس میں اختلاف رکھتے ہیں کیونکہ ان کے ہاں پہلی تکبیر کے بعد سورہ فاتحہ پڑھی جائے گی اور اس کی دلیل قوی ہے۔ ہمارے علماء میں سے شر بنلالی کا یہی کہنا ہے اور اس نے اس بارہ میں ایک رسالہ بھی تحریر کیا ہے۔

اور تعلیق الممجد میں ہے:

قالوا لو قرأها بنية الدعاء لا باس به ويحتمل ان يكون نفيا للزومه فلا يكون فيه نفى الجواز واليه مال حسن الشر بنلالى من متاخرى اصحابنا حيث صنف رسالة سماها بالنظم المستطاب لحكم القرأة فى صلوة الجنازة بأم الكتاب وردّ فيها على من ذكر الكراهة بدلائل شافية وهذا هو الاولى لثبوت ذلك عن رسول الله ﷺ واصحابه الخ ـ

اگر بغض دعاء پڑھ لے کوئی حرج نہیں اور ہو سکتا ہے کہ اس کے لزوم کی نفی ہو (یعنی لا باس بلزومہ کہ اسے لازمی قرار دینے میں کوئی مضائقہ نہیں) تو اس صورت میں جواز کی نفی نہ ہو۔ ہمارے متاخرین اماموں میں سے حسن شر بنلالی کا یہی خیال ہے۔ انہوں نے اس بارے میں ایک رسالہ جس کا نام "النظم المستطاب لحکم القرأۃ فی صلاۃ الجنازۃ بام الکتاب"۔ اس رسالہ میں انہوں نے ان لوگوں کی تردید میں جو اسے مکروہ جانتے ہیں مسکت دلائل ذکر کئے ہیں اور یہی بہتر ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام اور ان کے صحابہ کے عمل سے یہ ثابت ہو چکا ہے۔ (تمت بالخیر)